شمیم حنفی

(ڈرامے)

شمیم حنفی

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

بار اوّل: نومبر ۱۹۸۸ء　　تعداد 750　　قیمت: -/36

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

خالد رفیع رحمانی

کے نام

ترتیب

میں نے غیر معمولی واقعات، تجربات اور انہونی باتوں
کے بارے میں صرف پڑھا ہے۔

لیکن، زندگی کو میں نے دیکھا ہے اُس کے عام رنگوں
اور عام معاملات کے واسطے سے۔

یہی واسطہ میرے لیے زندگی کی شناخت اور تفہیم،
دُنیا سے نفرت اور محبت، زندگی کی طرف سے مایوسی
اور اُمید کی سطحیں فراہم کرتا ہے۔

مٹی کا بلاوا اور مجھے گھر یاد آتا ہے کے بعد، ڈراموں کی
اس تیسری کتاب میں بھی بناؤ اور بگاڑ کے وہی تماشے
موجود ہیں، جن کا تعلق عام انسانوں اور زندگی کے
عام رویوں سے ہے۔

مگر، پھر بھی، زندگی کے بھید بہت گہرے ہیں، ناقابلِ فہم
اور منطق سے ماورا!

شمیم حنفی

اکیلا

آوازیں

عرفان : ایک شکّی نوجوان۔ کسی پر بھروسا نہ کرنے کی عادت۔
خالوجان : عرفان کے خالو (مجّن میاں) باتونی۔ لفّاظ۔
خالہ جان : عرفان کی خالہ۔ باتونی۔ چڑچڑی۔
غلام بخش : عرفان کے خالو کا ملازم لڑکا۔
سلطان : عرفان کا ملازم۔
اختر
رشید | عرفان کے دوست۔
آفتاب
اچھن باجی: عرفان کی پھوپھی۔ نیک اور سیدھی سادی خاتون
سلطانہ: اچھن باجی کی جوان بیٹی۔

فیڈان :۔ ابتدائی موسیقی ،مضحک ـــــ

فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی دروازے پر لگی ہوئی کال بیل مسلسل بجنے لگتی ہے۔

عرفان :۔ (دور سے) آرہا ہوں ، آرہا ہوں ، ابھی آیا۔

[کال بیل بجتی رہتی ہے]

عرفان :۔ (دور سے دانت پیستے ہوئے) اُفوّہ ! ارے آرہا ہوں ۔ ابھی آیا۔ دو منٹ میں۔

[کال بیل بج رہی ہے]

عرفان :۔ (انتہائی جھلاہٹ کے ساتھ، دور سے) خدا جانے کون مردود ہے۔ دم نہیں لیتا۔ آرہا ہوں۔

[بھاگتا ہوا آتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔]

عرفان :۔ (بوکھلاکر) ارے، خالو جان آپ ! مم میں سمجھا ـــــ

خالو جان :۔ (طنزیہ لہجے میں) ہاں ہاں برخوردار، تم نے ٹھیک ہی سمجھا۔ میں واقعی مردود ہوں کہ اس وقت ـــــ

عرفان :۔ (گڑبڑاکر) اوہ ! تو آپ نے سن لیا تھا۔ مم ـــــ میرا مطلب ہے۔

خالو جان :۔ (بدستور طنزیہ لہجے میں) تمھارا مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔ میاں۔ آج کل دنیا

ہی بدل چکی ہے پھر تم کیا اور میں کیا؟

عرفان :۔ (معافی طلب انداز میں) خالو جان!

خالو جان :۔ میاں کالی صدی ہے، کالی صدی۔ تمیز، تہذیب، ادب آداب سب کا جنازہ نکل چکا۔

عرفان :۔ (تاسف آمیز انداز میں) آپ اندر تو آیئے، مم معاف کر دیجیے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت بغیر کسی اطلاع کے آپ ـــ

خالو جان :۔ (بات کاٹ کر) ہاں ہاں میاں، کیوں نہیں۔ پیشی کی درخواست دیے بغیر اچانک ٹپک پڑنا واقعی بڑی سخت غلطی ہے۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ آنے سے پہلے تم سے اجازت ـــ

عرفان :۔ اُفوہ! خالو جان! آپ، آپ سمجھتے کیوں نہیں؟

خالو جان :۔ (طنز سے) میاں، ہم تو ٹھہرے ناسمجھ، اُجڈ، گنوار، پرانے وقتوں کے جاہل ـــ ہم کیا سمجھیں ـــ سارا علم تو تمہاری گھٹی میں پڑا ہے۔ کالی صدی کا علم نیا، انداز نئے، رنگ نئے، ڈھنگ نئے ـــ خیر ـــ ہوگا۔

عرفان :۔ بیٹھیے خالو جان، خدا قسم میں سمجھا کہ خان صاحب ہیں۔

خالو جان :۔ خان صاحب؛ خان صاحب کون؟

عرفان :۔ ارے وہ ارشاد چچا کے ایک بچپن کے دوست تھے نا، وہی جنھوں نے اپنی ساری جائداد جوے میں لٹا دی تھی۔

خالو جان :۔ (کچھ سوچ کر) ہوں! تو وہ مردود ہو گئے۔ کیوں نہ ہوں میاں! آخر کو تمھارے چچا کے دوست ہیں۔ بہت خوب۔

عرفان :۔ (ملتجیانہ انداز میں) خالو جان! چائے منگواؤں! مم میں خود لے کر آتا ہوں۔

خالو جان :۔ (حیرت سے) کیوں، آج بوا نہیں آئیں کیا؟

عرفان :۔ نن نہیں۔ انھیں میں نے ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا ہے۔ مجھے اکیلا دیکھ کر وہ گھر صاف کیے دے رہی تھیں۔

خالوجان :۔ (کچھ سوچ کر) ہوں! اور وہ لونڈا کہاں گیا؟

عرفان :۔ کون؟

خالوجان :۔ ارے وہی جو تمھارے یہاں کام سے لگا ہوا تھا۔ بھلا سا نام تھا۔

عرفان :۔ اوہ، وہ قادر؟

خالوجان :۔ ہاں ہاں، قادر ۔

عرفان :۔ اسے بھی نکال دیا ہے میں نے ۔ کمبخت سے روپے کی چیز منگواؤں تو اٹھنی بچا لیتا تھا۔ عادت بگڑ گئی تھی۔ مجھے اکیلا سمجھ کر ۔

خالوجان :۔ (ہنس کر) اوہ! تو اب سمجھ میں آئی بات۔ تمھاری تنہائی ہی اصل مصیبت ہے، یا ساری مصیبتوں کی جڑ۔ میاں، کتنی بار کہا ۔ گھر بسا لو۔ ماشاء اللہ سے اچھی کمائی ہے۔ زمین جائداد الگ ۔ پھر اللہ مغفرت کرے۔ تمھارے ابا مرحوم نے پیسے کو ہمیشہ دانت سے پکڑا۔ اتنا چھوڑ کر مرے کہ تمھاری دو چار پشتیں چین سے گھر بیٹھے کھا سکتی ہیں۔ دس کو کھلا سکتی ہیں۔ کمی کس بات کی ہے۔ سوائے اس کے کہ گھر سونا ہے ۔

عرفان :۔ (جلدی سے) وہ خالوجان، بات یہ ہے کہ ۔

خالوجان :۔ میاں بات کیا؟ اصل تو یہی ہے کہ گھر والی سے ہوتا ہے۔ تمھاری اماں مرحومہ نے اچھن باجی کو زبان دے دی تھی۔ آج تک ان کی بیٹی کنواری بیٹھی ہے ۔ اسی انتظار میں کہ کب تم ہاں کرو! دیر کس بات کی ہے؟ عرفان میاں! کبھی تو سوچو کہ تمھاری اماں مرحومہ ۔

عرفان :۔ اصل میں خالوجان! یہ گھرداری میرے بس کی چیز ہے ہی نہیں۔ ہم میں ۔

خالوجان :۔ (طنز سے) ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ گھر والی ہوگی تو خرچ بڑھے گا۔ فرمایش۔ گھر کا بوجھ۔ پھر بال بچے ہو گئے تو اسکول مدرسے کا خرچ الگ۔ عزیز رشتے داروں کا آنا جانا الگ۔ میاں گھر تو ہم جیسے قلاشوں کے چلانے کی چیز ہوتی ہے ۔ ماشاء اللہ سے دس بچے گھر میں ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی مہمان ۔ دوست

احباب۔ لیکن گاڑی چل رہی ہے۔ یوں اگر تمھیں اچھن باجی کی لونڈیا پسند نہیں تو ـــ

عرفان :۔ (پسپا ہوکر) خالو جان ـ

[پس منظر سے طربیہ موسیقی کی ایک لہر]

ـ فیڈ آوٹ ـ

فیڈان :۔

[باورچی خانے میں کھٹ پٹ۔ خالہ جان غصے میں کوئی برتن زمین پر لڑھکا دیتی ہیں]

خالہ جان :۔ (بڑبڑاتے ہوئے) نہیں کرتا میری بلا سے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑاؤں۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ زمانے بھر کی فکر ہے آپ کو ـــ صبح صبح اس نگوڑمارے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ آخر منہ کی کھائی۔ اور جائیے وہاں۔ بڑا چہیتا ہے نا! اسے ہماری فکر لگی ہوئی ہے تو آپ کو اُس کی فکر کیوں نہ ہو؟

خالو جان :۔ (قریب آتے ہوئے) ہے ہے بیگم ـــ صبح سے گلا سوکھ رہا ہے۔ نہ حریرہ ملا نہ حقہ۔ (چلاتے ہوئے) ابے غلام بخش ـــ او غلام بخش کے بچے ـ کہاں مرگیا؟

غلام بخش :۔ (دور سے) آریا اوں (آرہا ہوں)!

[بھاگتا ہوا آتا ہے]

خالو جان :۔ کیوں بے چپڑ قناتی ـــ تجھ سے ہزار مرتبہ کہا کہ صبح سویرے حقہ تازہ کیے بغیر کسی اور کام کو ہاتھ نہ لگایا کر۔

خالہ جان :۔ اے لو! اب اس غریب کے پیچھے پڑ گئے۔ مت ماری گئی ہے۔ صبح سے لکڑیاں چیر رہا ہے۔ کوئی دس ہاتھ پیر تو ہیں نہیں اُس کے۔ پھر صبح ہوئی اور انجن کی طرح بھنی بھنی حلق سے دھواں چھوٹنے لگا۔ کوئی بات ہے۔ موا کلیجہ جل کر کالا ہوگیا ہوگا۔

خالو جان :۔ (جھنجھلا کر) تم سے خدا بچائے بیگم۔ (غلام بخش سے) سن بے! جلدی جا کر حقہ

تازہ کردے اور ہاں! رسولن سے کہہ دے کہ حریرہ اگر پانچ منٹ کے اندر تیار نہ ہو گیا تو ـــ

خالہ جان :۔ لو اور سنو! میں چولھے کے سامنے بیٹھی آنکھیں سینک رہی ہوں اور کہا جا رہا ہے رسولن سے۔ نگوڑ ماری ابھی آئی کہاں۔

خالو جان :۔ نہیں آئی ابھی رسولن ؟

خالہ جان :۔ تو میں کیا کہہ رہی ہوں اتنے دیر سے۔ فجر کے بعد سے چلّی چولھے میں لگی ہوئی ہوں۔ کیوں نہ ہو؟ میں ہی تو اس گھر میں سب سے سستی ہوں۔ جوان جہاں لونڈیاں گھر میں ہیں لیکن کیا مجال کہ ایک تنکا بھی ہلا دیں۔ ابھی سب کی سب چادر تانے اینڈ رہی ہوں گی۔ اور صاحبزادے ہیں تو ان کا تو کہنا ہی کیا۔ رات ایک بجے بائیسکوپ دیکھ کر لوٹے تھے۔ کھانا گرم کیا۔ کھلایا پلایا۔ ڈھائی بجے بستر سے پیٹھ لگی ہے۔ کتنا سمجھایا کہ بیٹا! خدائی وقت ہے۔ ہوش میں آجاؤ۔ کچھ پڑھو لکھو۔ لیکن اس کے دماغ میں تو ضد سمائی ہے۔ نگوڑا۔ ایک دم باپ پر گیا ہے ـــ عرفان نے کہا تھا ـــــ

خالو جان :۔ (بگڑ کر) عرفان! عرفان! اُس کا نام نہ لینا میرے سامنے۔

خالہ جان :۔ (ایک دم چمک کر) ہے ہے، تو کیا ایک دم ہی منہ پھیر لوں۔ آخر کو میری ہی جان کا ٹکڑا ہے۔ ایک خون ہے۔ آپا جان نے آخری ہچکی لیتے لیتے میرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔ (روہانسی ہو کر) "بہن! اوپر خدا ہے، نیچے تم ہو! میرے بچے کا خیال رکھنا۔ بڑے جتنوں سے پالا ہے ـــ" اللہ۔ (روتی ہوئی) کیسے بھول جاؤں؟ کیسے بھول جاؤں؟ (اچانک موڈ بدل کر) تمھارا دل تو پتھر کا ہے۔

خالو جان :۔ (کچکچا کر) اُفوہ، میرے خدا، کیا مصیبت ہے؟ صبح صبح اس پر لعن طعن ہو رہی تھی، پھر اچانک پٹری ایک دم بدل گئی۔ اب وہی جان کا ٹکڑا ہو گیا۔ ملزم ٹھہرا میں!

خالہ جان :۔ (چمک کر) ہاں ہاں تم! تم! تم نے کہا نہیں تھا کہ اب اس کا منہ نہ دیکھوں گا!
خالو جان :۔ کہا تو تھا، پھر؟
خالہ جان :۔ پھر کیا؟ اللہ رکھے اُسے کمی کیا ہے؟ کوئی تمھاری محبت کا محتاج تھوڑی ہے۔
آخر کو ماں نہ سہی، میں تو ہوں۔ سگے بھائی بہن نہ سہی دس دس خالہ زاد تو ہیں۔
میں تو ایک دنیا کو اس پر قربان کر دوں! میرا بچہ (رونے لگتی ہیں)
[دروازے پر دستک]
خالہ جان :۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) غلام بخش، دیکھ تو کون نگوڑ مارا ہے، صبح صبح دروازے
پر لٹھ بازی شروع کر دی۔ میر صاحب ہوں تو ٹال دینا۔ کہ دینا گھر میں نہیں ہیں۔
نہیں تو چائے پیے بغیر کھسکیں گے بھلا۔ پھر اُن کی بک بک۔ صبح صبح چائے
پلاؤ، پھر بیٹھ کر گلوریاں بناؤ۔ خاصدان میں سجاؤ۔ تمباکو کمبخت اتنی کھاتا ہے کہ
بھینس چارہ کھانا بھول جائے۔
خالو جان :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بیگم! وہ حریرہ۔
خالہ جان :۔ (چمک کر) سن لیا، سن لیا۔ اب مشین تو ہوں نہیں۔
(غلام بخش آتا ہے)
غلام بخش :۔ عرفان بھیا آئے ہیں۔
خالو جان :۔ (چونک کر) عرفان؟ عرفان؟
خالہ جان :۔ (زور سے) ہاں ہاں عرفان؟ تو اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ (پکار کر)
آجاؤ بیٹے!
(عرفان آتا ہے)
عرفان :۔ آداب خالہ جان!
خالہ جان :۔ جیتے رہو بیٹا۔ پھلو پھولو!
عرفان :۔ خالو جان آداب۔
خالو جان :۔ آداب!

خالہ جان :۔ (بگڑ کر) لو دیکھ لو! لٹھ مار دیا۔ چھوٹوں کے سلام کا جواب دینا بھی نہیں آتا۔ (منہ بنا کر) آداب ـــ بھلا یہ بھی کوئی بزرگوں کے ڈھنگ ہیں۔ بیٹھو بیٹا بیٹھو! میں ابھی تر تراتے ہوئے پراٹھے نکالتی ہوں۔ سوجی کا حلوہ بھی تیار ہے۔ پیاز کاٹ کر خاگینہ بنائے دیتی ہوں۔ چہرہ کیسا اترا ہوا ہے۔ وہ موئی تمھاری بوا پھیکا سیٹھا آگے رکھ دیتی ہوگی۔ اس طرح کہیں اناج بدن کو لگتا ہے ـ پھر ہر چیز میں ملاوٹ۔ آٹا جیسے ریت ـــ میں نے تو دیسی گیہوں کی پانچ بوریاں منگوا لی تھیں۔ ماشاءاللہ سے بارہ نفر کھانے والے، نوکر چاکر الگ۔ بن بلائے مہمان الگ۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی ٹپکا ہوا ہے۔ کمبخت خالی پیٹ چلے آتے ہیں۔ مربھکوں کی طرح ۔

عرفان :۔ (جلدی سے) میں ناشتہ کر کے آیا ہوں خالہ جان!

خالہ جان :۔ (پیار سے) بکو مت! موئی ڈبل روٹی کے دو قتلے حلق میں اتار لیے ہوں گے۔ یہ بھی کوئی ناشتہ ہے۔ میاں تمھاری عمر کے بچّے بھلا اس طرح کھاتے پیتے ہیں۔

خالو جان :۔ بکرے کی مسلّم ران ناشتے کے وقت اڑا دیتا تھا میاں! وہ بھی کیا دن تھے؛

خالہ جان :۔ لو اور سنو! اور اب تو فاقے کر رہے ہو نا؟ اچھے سے اچھا کھلاتی ہوں ـ تینوں وقت حلق تک بھر کر کھاتے ہو۔ دن بھر منہ الگ چلتا رہتا ہے۔ ایک دن میں کوئی دو چھٹانک چھالیہ پھانک ڈالتے ہو ـ

خالو جان :۔ آؤ میاں عرفان! اُدھر برآمدے میں چلتے ہیں۔ تمھارا ناشتہ وہیں آجائے گا۔

خالہ جان :۔ ہاں ہاں لے جاؤ! خالہ کی محبت میں بیچارہ تڑپ رہا ہے۔ صبح صبح آپہنچا اور آپ ہیں کہ گھڑی بھر بات کرتے نہیں دیکھ سکتے۔

عرفان :۔ (ہنس کر) ارے خالہ جان! یہ بات نہیں۔ میں تو دراصل خالو جان سے معافی مانگنے آیا تھا۔

خالہ جان :۔ معافی؛ کیسی معافی؛ خدا نہ کرے تم جیسے ہونہار بچے سے بھلا ایسی کون سی

خطا ہوگئی ؟

عرفان :۔ کوئی خاص بات نہیں خالہ جان، یوں ہی ذرا ۔

خالوجان :۔ (جلدی سے) آؤ میاں چلو! یہاں انتڑیاں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں ۔ گلا سوکھ کر کانٹا ہوگیا ۔ (چلاکر) ابے کہاں چلا گیا غلام بخشے! ۔۔۔ خیر! آؤ ۔ اور بیگم، ذرا جلدی کر دو ۔ واللہ کیا عمدہ پراٹھے تلتی ہو تم ۔

خالہ جان :۔ بس بس! رال ٹپکنے لگی ۔ بوڑھے ہونے کو آئے لیکن کوئی بچہ بھی کیا ندیدا ہوگا؟ اور جہاں تک پراٹھوں کا سوال ہے آپا جانی ایسے عمدہ ورقی پراٹھے بناتی تھیں کہ جیسے کاغذ کے ورق جمے ہوں ۔ جس نے کھایا دوبارہ کھانے کی فرمائش کر دی ۔ پھر خدا بھلا کرے، اُن دنوں دیسی گھی بھی روپے کا پاؤ بھر مل جاتا تھا ۔ بناسپتی کا نام بھی کون لیتا تھا ۔ اور اب تو بناسپتی کھا کھا کر بچے عینک چڑھانے لگے ہیں ۔ غضب خدا کا ۔۔۔ ابا جان اسی کے ہوگئے تھے اور اخباریوں فرفر پڑھتے تھے، بلا عینک لگائے، جیسے بچے آموختہ سناتے ہیں ۔۔۔ تم نے ۔۔۔

خالوجان :۔ (اکتاکر) چلو بھی میاں عرفان! اور ہاں بیگم ذرا جلدی کر دو ۔ وہ حریرہ ۔

خالہ جان :۔ اوں ہوں ۔۔۔ نیت پر تو ۔۔۔ (رک کر) اب کیا کہوں! صبح سے لگی ہوئی ہوں ۔ رسولن کی بچی کو بھی آج ہی ناغہ کرنا تھا ۔ میں نے بھی اس مہینے میں ایک دن کی تنخواہ نہ کاٹی ہو تو میرا ذمہ ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ۔ جب دیکھو ۔۔۔

خالوجان :۔ (خوفزدہ ہوکر) عرفان میاں ۔۔۔ چلو، چلو ۔۔۔ بیگم کی زبان اس سواری کی طرح ہے جو صرف چلتی رہتی ہے، رکنے کا نام ہی نہیں لیتی ۔ چلو ۔

[دونوں جاتے ہیں]

(عرفان ہنستا ہے ۔ پیچھے سے خالہ جان کے بڑبڑانے کی آواز دونوں کا تعاقب کرتی ہے ۔۔۔ "لو جی! میری زبان پر طعنے توڑے جا رہے ہیں، خود کو نہیں دیکھتے ہو نہہ ۔۔۔ صبح سے جان کھا لی ۔ اور مجھے زبان کو ۔

ہونہہ ـــ "

فیڈ آؤٹ ۔

فیڈان :۔

[کال بیل بجتی ہے]

سلطان :۔ (دور سے) آیا ـــ آتا ہوں ۔

[دروازے کی طرف جاتا ہے]

اختر :۔ کیوں بھئی عرفان صاحب نہیں ہیں؟

سلطان :۔ ابھی دفتر سے لوٹے نہیں ۔

اختر :۔ لیکن لنچ کا وقت تو کب کا شروع ہو چکا. پھر چار قدم پر تو دفتر ہے ۔

سلطان :۔ (منہ بنا کر) میں کیا جانوں؟

اختر :۔ آخر کھانا کھانے تو آئیں گے نا؟

سلطان :۔ میں کیا جانوں ؟

اختر :۔ اچھا ایسا کرو! ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دو۔ میں انتظار کر لوں، آہی رہے ہوں گے ۔

سلطان :۔ میں کیا جانوں ؟ پھر ڈرائنگ روم میں تو تالا پڑا ہے ۔

اختر :۔ تالا پڑا ہے ۔ کیوں ؟

سلطان :۔ میں کیا جانوں ؟

اختر :۔ (جھنجھلا کر) ارے بھائی، کوئی بھلا آدمی آجائے تو اس کے بیٹھنے کو جگہ تو ہو گی ؟

سلطان :۔ میں کیا جانوں ؟

اختر :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) خیر! مجھے اندر تو آنے دو!

سلطان :۔ لیکن میں آپ کو تو جانتا نہیں!

اختر :۔ پھر کیا ہوا۔ میں کچھ لے کر بھاگ تو جاؤں گا نہیں ۔

سلطان :۔ (کچھ سوچ کر) اچھا آجایئے۔

[دونوں اندر جاتے ہیں]

سلطان :۔ وہ باورچی خانے کا پٹرا پڑا ہے۔ کہیے تو برآمدے میں رکھ دوں، اس پر بیٹھ جایئے۔

اختر :۔ (حیرت سے) اور یہ برآمدے کا فرنیچر کیا ہوا۔ بید کے مونڈھے پڑے رہتے تھے یہاں۔ کیا ہوئے؟

سلطان :۔ اسٹور میں ہیں۔

اختر :۔ اسٹور میں — کیوں؟

سلطان :۔ میں کیا جانوں؟

اختر :۔ (بڑبڑاتے ہوئے) میرے خدا، کیا قیامت ہے، کمبخت کے گھر میں بیٹھنے کی گنجایش بھی نہیں۔ منحوس کہیں کا!

سلطان :۔ جی صاحب! آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔

اختر :۔ (گڑبڑا کر) نہیں نہیں، تم اپنا کام کرو۔

سلطان :۔ کام کیا کروں صاحب! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

[کال بیل بجتی ہے]

سلطان :۔ (جلدی سے) صاحب آ گئے۔ (چلا کر) آیا صاحب!

سلطان :۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) آپ کا انتظار کر رہے ہیں ایک صاحب!

عرفان :۔ (اندر آتے ہوئے) کون؟

سلطان :۔ میں کیا جانوں؟

(دونوں اندر آتے ہیں)

عرفان :۔ (چونک کر) ارے اختر تم؟ بیٹھو بیٹھو!

اختر :۔ (ناگواری سے) کہاں بیٹھوں؟ تمھارے سر پر۔

عرفان :۔ (خفت آمیز لہجے میں) اوہ! معاف کرنا — سلطان! یہ لو چابی اور اسٹور سے

مونڈھے نکال لاؤ۔

سلطان :۔ جی صاحب! (چابی لے کر جاتا ہے)

عرفان :۔ اچھا رہنے دو — لاؤ چابی! ہم ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھتے ہیں۔ تم اتنی دیر میں کھانا لگادو۔

[دونوں جاتے ہیں۔ عرفان ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر پنکھا چلاتا ہے]

اختر :۔ تمھارے گھر میں ہر دروازہ مقفل دکھائی دیتا ہے۔ آخر بات کیا ہے۔ (طنز سے) آخر کیا کیا چھپا رکھا ہے تم نے۔ مونڈھے تک اسٹور میں۔

عرفان :۔ (جلدی سے) کیا بتاؤں یار۔ وہ قادر تھا نا! میرا پرانا ملازم - جاتے جاتے باورچی خانے کے برتن اور صابن دانی تک اٹھالے گیا۔ بوا نے برآمدے سے تخت پوش اڑادیا۔ وہ تو شاید تخت بھی اٹھالے جاتیں — سب چور ہیں۔ کس پر بھروسہ کیا جائے۔ میں اکیلا آدمی ہوں۔ بس اسی کمزوری سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو جس کے ہاتھ لگ گیا۔ اب میں کہاں کہاں نظر رکھوں!

اختر :۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟

عرفان :۔ کیوں؟ ضرورت کیوں نہیں؟

اختر :۔ شادی کرلو — یا پھر کوئی قابل اعتبار نوکر رکھ لو۔

عرفان :۔ قابل اعتبار؟ اعتبار کرنے کا ہی تو نتیجہ تھا۔ پچھلے مہینے میں چھ گلاس خریدے تھے۔ چار قادر میاں نے غائب کردیے۔ پوچھا تو کہہ دیا کہ ٹوٹ گئے۔ جب میں نے جرح کی کہ کانچ کے ٹکڑے دکھاؤ تو بولے کہ مہترانی کوڑے کے ساتھ اٹھا لے گئی۔

سلطان :۔ (اندر آتے ہوئے) صاحب!

عرفان :۔ کیا ہے؟

سلطان :۔ کھانا لاؤں؟

عرفان :۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ لاؤ!

[سلطان جاتا ہے]

عرفان :۔ تم اس وقت آئے کیسے؟ خیریت تو؟

اختر :۔ (ہنس کر) کیوں؟ خیریت نہ ہو تو تمھارے پاس نہیں آنا چاہیے؟

عرفان :۔ نن نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ عین دوپہر ہیں۔

[سلطان برتن لے کر کمرے میں آتا ہے اور میز پر برتن رکھتا ہے]

سلطان :۔ کھانا لگ گیا صاحب!

عرفان :۔ آؤ بھائی اختر۔ جو کچھ روکھا سوکھا ہے حاضر ہے!

اختر :۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ یاروں سے تکلف کیسا؟

[دونوں کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں۔ کرسی گھسیٹنے کی آوازیں]

عرفان :۔ (منہ میں لقمہ لیے ہوئے) سلطان! (غصے میں) او سلطان!

سلطان :۔ (دور سے) آیا صاحب! (بھاگتا ہوا آتا ہے)

عرفان :۔ (بگڑ کر) یہ تماشا کیا ہے۔ سالن میں نمک نہیں۔ دال میں پانی ہی پانی۔

سلطان :۔ (گڑبڑا کر) اب میں کیا جانوں؟

عرفان :۔ معاف کرنا بھائی اختر — ہونہہ۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں کہ تمھارے سامنے یہ ذلیل کھانا رکھا ہوا ہے۔ ارے نامراد، چکھ لیا کرو اگر ابھی اچھی طرح نمک کا اندازہ بھی نہیں — توبہ توبہ۔

سلطان :۔ (بوکھلا کر) وہ ب ب بات یہ تھی کہ —

عرفان :۔ (جلدی سے) کیا بات تھی۔

سلطان :۔ نمک کی شیشی آپ الماری میں بند کر گئے تھے نا۔

عرفان :۔ (خفیف ہو کر) جھوٹا کہیں کا! اور میں الگ سے نکال نہیں گیا تھا۔

سلطان :۔ (گستاخانہ لہجے میں) صاحب جب ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے سامنے لایا جائے گا تو یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ نمک کم تھا، پانی بڑھا دیا، دال اور سالن دونوں میں یہی کرنا پڑا۔

عرفان :۔ چپ رہو۔ تو کیا اور دال گھر میں نہیں تھی؟

سلطان :۔ تھی تو، مگر الماری میں۔ چابی تو آپ لے گئے تھے۔

عرفان :۔ اب اختر۔ دیکھو! زبان لڑائے جا رہا ہے۔ ابے تو کیا مجھ سے مانگ نہیں سکتا تھا۔

سلطان :۔ مانگتا کیا۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جتنا نکال دوں اُسی میں کام چلاؤ۔

عرفان :۔ (غصّے میں) گستاخ، بدتمیز، گنوار ۔۔۔ بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ چاہتا ہے لٹا دوں سب کچھ۔ اکیلا آدمی۔ اگر اتنی نظر نہ رکھوں تو گھر کی اینٹ تک سلامت نہ رہے۔ الماری کھلی چھوڑ جاؤں۔ تو مہینے بھر کا راشن دو دن میں صاف ہو جائے۔

اختر :۔ (مداخلت کرتے ہوئے) اونہہ چھوڑو بھی یار۔ تم تو پیچھے پڑ گئے پنجے جھاڑ کر۔ کھانا تو مزے کا ہے۔

عرفان :۔ کیا خاک مزے کا ہے۔ سامنے کہہ رہے ہو، بعد میں ہنسی اڑاؤ گے۔ خیر۔ ہو گا۔ سلطان! آج تو میں نے معاف کر دیا لیکن کل سے یہ گڑبڑ نہ ہو۔

سلطان :۔ (ناگواری کے انداز میں) اب کل سے تو اس کو سمجھائیے گا جو کل یہاں موجود ہو۔

عرفان :۔ کل کیا مطلب؟

سلطان :۔ مطلب یہ ہے کہیں جا رہا ہوں۔ میرا حساب کر دیجیے۔

عرفان :۔ (زچ ہو کر) اچھا خدا کے لیے ابھی تو دفعان ہو جاؤ۔ اختر کے جانے کے بعد باتیں ہوں گی ۔۔۔ ہوں! تو اختر؟ کیسے آنا ہوا؟

اختر :۔ کوئی خاص بلت نہیں۔ بس یوں ہی۔

عرفان :۔ کوئی بات تو ہو گی؟

اختر :۔ بات بہت معمولی سی ہے۔ میں اپنا ایک لفافہ تمھارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں۔ اس میں کچھ بہت ضروری کاغذات ہیں۔ ذاتی نوعیت کے۔ تم اس لفافے کو اپنے پاس رکھ لو۔ تمھیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میں دو مہینے کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔

عرفان :۔ (کچھ سوچ کر) ہوں!
اختر :۔ (رک کر) تم سوچ کیا رہے ہو؟
عرفان :۔ ان کاغذات کی نوعیت کیا ہے؟
اختر :۔ تم کو اس سے کیا؟ تمھیں تو بس انھیں محفوظ رکھنا ہے۔ میں واپس آکر تم سے لے لوں گا۔ یا پھر اگر جلدی نہ آیا تو تمھیں ایک پتا لکھ بھیجوں گا۔ اس پر پہنچا دینا۔
عرفان :۔ (حیرت سے) پتا؟ کس کا پتا؟
اختر :۔ (ناگواری سے) تمھیں اس سے بھی کوئی مطلب نہ ہونا چاہیے۔
عرفان :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) بھائی معاف کرنا۔ میں ذرا محتاط آدمی ہوں۔ بغیر جانے بوجھے اس طرح کی ذمے داری لینا، تم ہی سوچو، خدا جانے اس لفافے میں کیا ہو؟
اختر :۔ اس لفافے میں ہائیڈروجن بم بنانے کا فارمولہ ہے۔ یہی نا! (اٹھتے ہوئے) میں نے تمھارے پاس آکر غلطی کی ــــ میرا اندازہ غلط تھا۔ خیر۔ خدا حافظ۔
[غصّے میں دروازے کو زور سے بند کر کے چلا جاتا ہے]
[پس منظر سے مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

۔ فیڈ آوٹ ۔

فیڈ ان :۔
[اچھن باجی سلائی کی مشین لیے کپڑا سی رہی ہیں اور مُنہ ہی منہ میں بڑبڑائے جا رہی ہیں]
اچھن باجی :۔ اونہہ ہوگا! مجھے کیا۔ نہیں کرتا نہ کرے۔ کوئی بھیک تھوڑی مانگی ہے اُس سے! (کھانستے ہوئے) سلطانہ! او سلطانہ ــــ (گلے میں کھانسی کا پھندا لگ جاتا ہے۔ مشین رک جاتی ہے)
سلطانہ :۔ (دور سے) آئی امی! (آتی ہے)
اچھن باجی :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں کھانستے ہوئے) پپ پانی۔ پانی لاؤ۔ ذرا جلدی لاؤ بیٹی!

سلطانہ :۔ (تیز قدموں سے لوٹتے ہوئے) ابھی لائی ۔

[کھانسی کا دورہ پھر اچھن باجی کو بے حال کر دیتا ہے]

سلطانہ :۔ یہ لو پانی امی ! تم بھی تو وقت ناوقت کام کرنے بیٹھ جاتی ہو۔ آرام کرنا چاہیے تھا اس وقت ۔

اچھن باجی :۔ (ہانپتے ہوئے) شاید چھالیہ کا کوئی ٹکڑا اٹک گیا تھا گلے میں۔ (پانی پینے کے بعد) پھر یہ بھی کوئی کام میں کام ہے۔ شہلا کے بچے کے لیے چار جوڑے بھیجنے تھے۔ میں نے کہا سِل ڈالوں۔ ذرا سا تو کام تھا۔

[دروازے پر دستک]

اچھن باجی :۔ دیکھو تو بیٹی کون ہے ؟

خالو جان :۔ (دور سے) ارے یہ میں ہوں اچھن باجی ۔ (کھنکار کر گلا صاف کرتے ہیں)

اچھن باجی :۔ کون ! مجن میاں ! آؤ آؤ۔ کئی دنوں بعد خبر لی ۔ (کھانسنے لگتی ہیں)

[خالو جان آتے ہیں]

خالو جان :۔ ارے ۔ آپ تو بے حال ہو رہی ہیں اچھن باجی ۔ نصیب دشمناں ،طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی ۔

سلطانہ :۔ آداب ماموں جان !

خالو جان :۔ او ہ سلطانہ بیٹی ۔ بھئی واہ ۔ میں تو سمجھا تھا تم کالج گئی ہوگی ۔

سلطانہ :۔ آج نہیں گئی ماموں جان ۔ ابھی پڑھائی تو شروع ہوئی نہیں ۔

خالو جان :۔ پڑھائی ! پڑھائی کیا ہوگی بیٹی ۔ پڑھنے والے ہی نہ رہے ۔ خدا بھلا کرے ۔ ہم نے کبھی اپنے استادوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ۔ وہ ہمارے مولوی صاحب ہیں نا ۔ مولوی کرامت ! کوئی نوّے کے پیٹے میں ہوں گے ۔ کمر جھک گئی ہے لیکن آواز ایسی کڑکدار ہے کہ خدا کی پناہ ۔ اب بھی سنتا ہوں تو روح لرز جاتی ہے ۔ میں نے بچپن میں ان سے پڑھا تھا ۔ اب تک جہاں ملتے ہیں انھیں دیکھ کر سٹی گم ہو جاتی ہے ۔ پتا نہیں کس بات پر دو چار قمچیاں جڑ دیں ———

[اچانک اچھن باجی کھانسنے لگتی ہیں]

خالوجان:۔ (چونک کر) ارے — تو کیا آپ کی طبیعت واقعی خراب ہے اچھن باجی۔ میں تو سمجھا کہ یوں ہی۔ سلطانہ بیٹی! تم جاکر اپنا کام کرو۔ میں تو یہاں ہوں ہی۔ کوئی ضرورت پڑی تو تمھیں آواز دے کر بلالوں گا۔ تم بالکل بے فکر رہو۔

اچھن باجی:۔ جاؤ بیٹی، مجن میاں کے لیے چائے بنالاؤ۔

خالوجان:۔ چائے؟ نابابا؟ مجھ سے یہ حقے کا پانی نہیں پیا جاتا۔ صبح کو حریرہ اور وقت ناوقت اگر کچھ پینے کا جی چاہا تو شربت۔ بادام کا ہو، فالسے کا ہو، خس کا ہو، گڑہل کا ہو، دوا کی دوا، غذا کی غذا۔ وہ جو تمباکو والوں کی گلی میں حکیم صاحب تھے۔ وہی جن کا لڑکا تالاب میں ڈوب گیا تھا —

اچھن باجی:۔ (بات کاٹ کر) جاؤ بیٹی۔ شربت لے آؤ۔ میرے بستر کے سرہانے والی الماری پر خس کی ایک نئی بوتل رکھی ہے۔

[سلطانہ جاتی ہے]

اچھن باجی:۔ تو کیسے آنا ہوا مجن میاں!

خالوجان:۔ وہ میں کہہ رہا تھا نا کہ تمباکو والوں کی گلی کے حکیم صاحب — جن کا بیٹا —

اچھن باجی:۔ (بات کاٹ کر) تو اس وقت کیسے آئے مجن میاں!

خالوجان:۔ اس وقت —؟ اوہ! یاد آگیا۔ کل میں اس گدھے کے یہاں پھر گیا تھا۔

اچھن باجی:۔ کون؟ عرفان؟

خالوجان:۔ ہاں ہاں! اور کون گدھا ہے۔ وہی بانگ لگائے جاتا ہے۔ گھربار سنبھالنا میرے بس میں نہیں۔ ہونہہ — گویا کہ وہ ساری دنیا سے ادیر ہے۔ ماشاءاللہ سے دس بچوں کا گھر میں نے سنبھال رکھا ہے۔ نوکر چاکر الگ۔ آئے دن کی مہمان داریاں الگ۔ خدا جانے آج کل کے لونڈوں کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ ہمتیں پست ہوگئی ہیں ان کی۔ زمانہ بدل گیا۔ بنا سپتی کھانے والے — ذرا سی بات میں حوصلے ہار بیٹھتے ہیں۔ اب اس کو دیکھیے — ارے کیا نام ہے۔ بھلا سا — عثمان،

ہاں عثمان ۔ رحمن میاں کا بیٹا۔ کل سر راہ مل گیا ۔ کہنے لگا ــــ

اچھن باجی :۔ (اکتاکر) تو کیا ہوا عرفان کا ؟

خالو جان :۔ ہو گا کیا ؟ بُرا حال ہے ۔ ایک نیا لونڈا ملا تھا۔ سودا سلف بھی کر دیتا تھا۔ الٹی سیدھی روٹیاں بھی ڈال دیتا ہوگا۔ وہ بھی کل چلا گیا۔ بوا پہلے ہی جواب دے گئی تھی۔ قادر نے اُس کا گھر چھوڑتے ہی ٹال کے پہلو میں چائے کی دکان لگا لی ہے۔

اچھن باجی :۔ (کھانستے ہوئے) میں عرفان کے بارے میں پوچھ رہی تھی مجن میاں (صاف لہجے میں) دنیا کا حال کسی اور وقت پر اٹھا رکھو۔

[سلطانہ کے پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے]

دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔

سلطانہ :۔ یہ لیجیے ماموں جان، شربت۔

خالو جان :۔ (خوش ہو کر) جیتی رہو بیٹی، جیتی رہو۔ اچھا جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ ضرورت ہوئی تو بلا لوں گا۔

سلطانہ :۔ جی ! (چل جاتی ہے)

خالو جان :۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اب تک وہ بیوقوف وہی ایک رٹ لگائے ہوئے ہے۔ ہزار بار سمجھایا۔ میاں گھر بسا لو ــــ اپنی ماں مرحومہ کی وصیت کا کچھ خیال کرو ــــ وہ غریب تو مرتے دم بھی وہ بات کہنا نہ بھولیں۔ آخر ہم سبھی اُن کے سرہانے موجود تھے۔ یہ نامراد بھی تھا۔ وہیں تو تھا نا ؟ اور ایسا بچہ بھی نہیں تھا کہ بات دھیان میں نہ آئی ہو۔ مگر ــــ

اچھن باجی :۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی مجن میاں کہ اس معاملے میں زور دینا ٹھیک نہیں ــــ میری بیٹی اب ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ کوئی پرسان حال نہ ہو۔ وہ تو زبان دی ہوئی ہے اسی لیے ہم بھی کسی اور طرف نہ سوچ سکے۔ ورنہ کیا ہو نہیں سکتا۔

خالو جان :۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ آپ اجازت دیں تو ایک دن میں بات پکی کر دوں۔ وہ ــــ

تھانیدار احمد علی صاحب ہیں نا؟

اچھن باجی :۔ کون احمد علی!

خالوجان :۔ ارے وہ ارشد چچا جو تھے، میرے ابا مرحوم کے دوست، اُن کے بیٹے۔ ہاں تو احمد علی ہی میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ زبان گھس ڈالی۔ کہتے ہیں کہ کسی طرح ہمارے خاندان سے ان کا ایک یہ تعلق بھی بن جائے۔ ان کی بیوی اشاروں میں کتنی بار مجھ سے سلطانہ کو پوچھ چکی ہیں۔ بھا گئی ہے لڑکی انھیں۔ اور کیوں نہ ہو، ہماری بیٹی ہے ہی ایسی۔ لاکھوں میں ایک، پڑھائی، کڑھائی، کھانا پکانا، تمیز تہذیب کس بات میں کم ہے؟

اچھن باجی :۔ (اکتاکر) خیر۔۔۔ وہ تو بعد کی بات ہے۔ خدا کو جو بھی منظور ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن آپ کو بھی قسم ہے پنجتن پاک کی۔ اب بھولے سے بھی عرفان کی طرف نہ سوچیے گا۔ نہ اس سے اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھوں گی نفیسہ باجی کے ساتھ اُن کی یہ بات بھی کھو گئی۔ جب وہی نہیں رہیں تو ان کی نافرمان اولاد سے کیا لینا دینا۔

خالوجان :۔ وہ تو ٹھیک ہے اچھن باجی ۔۔ لیکن ہم نے وہی کیا جو ہمارا فرض تھا۔ مرحومہ کی بات کی کچھ تو لاج رکھنی تھی۔ سو ہم نے تو اپنے بھر کوشش کر دیکھی۔ اب اگر اُس گدھے کی سمجھ میں نہیں آتا تو کیا کیا جائے؟ رنج تو بس اس بات کی ہے کہ مرحومہ کی روح بیقرار ہوگی۔

اچھن باجی :۔ (گلوگیر لہجے میں) چھوڑو بھی مجن میاں۔ اب یہ قصہ ختم ہی سمجھو۔ ہاں دل پر اس کا داغ مدتوں رہے گا۔ پھر وہ غریب بھی کیا سوچے گی؟ بچپن سے بس اس نگوڑے کا نام سنتی آئی تھی۔

خالوجان :۔ آپ فکر نہ کیجیے اچھن باجی۔ خدا نے چاہا تو ہماری سلطانہ عیش کرے گی عیش۔ اس سنکی کے پلے پڑتی تو نہ جانے کیا حال ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں اس میں بھی اللہ پاک کی کوئی مصلحت شامل ہے۔

اچھن باجی :۔ خیر ــــ جو ہوا اچھا ہوا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اور جو ہوگا ٹھیک ہی ہوگا۔
خالو جان :۔ انشاء اللہ ــــ تو میں کروں احمد علی سے بات۔
اچھن باجی :۔ اب اتنی جلدی بھی نہ کرو محسن میاں۔ ایسی کون سی لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے ــــ اچھی طرح سوچ لو۔ سلطانہ کے ابّا ہیں تو کسی کام کے نہیں۔ انھیں اپنے وظیفوں سے ہی فرصت کب ملتی ہے؟ انھوں نے یوں بھی گھر بار کا سارا انتظام مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ سیاہ کروں یا سفید۔ ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔
خالو جان :۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے اچھن باجی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ احمد علی کا بیٹا کہیں ہاتھ سے نکل جائے۔ افیم کے محکمے میں انسپکٹر لگا ہوا ہے۔ اچھی تنخواہ۔ پھر اوپر سے بھی خاصی آمد ہے۔ موٹر سائیکل لیے فراٹے بھرتا رہتا ہے۔ شکل صورت کسی بات میں عرفان سے کم نہیں۔
اچھن باجی :۔ پھر بھی، ایسی جلدی کیا ہے؟ کچھ دن تو ٹھہر جاؤ۔ سلطانہ کے دل سے بھی یہ نقش نکالنا ہے۔
خالو جان :۔ (ہنس کر) آپ بھی اچھن باجی۔ ارے سلطانہ کا کیا ہے۔ بچی ہے، ناسمجھ۔ اُسے شاید بھول کر بھی خیال نہ آتا ہو۔ آتا بھی ہو تو کیا۔ دو چار روز میں بھول بھال جائے گی۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ احمد علی کے کان میں یہ بات ڈال دوں۔
اچھن باجی :۔ کون سی بات؟
خالو جان :۔ یہی کہ آپ نے عرفان کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ پچھلی دفعہ احمد علی نے مجھ سے کہا تو میں نے انھیں بتا دیا تھا۔ اب کہہ دوں گا کہ آپ نے انکار کر دیا ہے۔
اچھن باجی :۔ لیکن انکار ہماری طرف سے تو ہوا نہیں۔
خالو جان :۔ اوں ہوں! آپ سمجھتیں کیوں نہیں۔ یہ تو میں کہنے سے رہا کہ انکار اس گدھے کی طرف سے ہوا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچیں۔ لڑکی ذات کا معاملہ۔ لوگ کہیں گے ہو نہ ہو کوئی بات تو ہوگی کہ لگی لگائی چھوٹ گئی۔ پھر یہی مناسب ہوگا کہ ــــ
اچھن باجی :۔ لیکن تم اتنی جلد بازی کیوں کر رہے ہو؟ احمد علی بھی ایسے کون سے ہوا کے

گھوڑے پر سوار ہیں۔

خالوجان :۔ اب زمانہ بدل گیا اچھن باجی۔ پہلے جہاں بیری کا جھاڑ ہوتا تھا پتھر آتے تھے۔ اب بیری خود پتھر کی طرف جاتی ہے۔ اب جہاں کوئی ڈھنگ کا لڑکا دکھائی دیا کہ لوگ لوٹ پڑتے ہیں۔ اب تو لڑکے خریدے جاتے ہیں۔

اچھن باجی :۔ (افسردگی سے) خیر! تم جیسا مناسب سمجھو — (گلوگیر لہجے میں) بس یہی ہے کہ بات کلیجے میں اترتی نہیں۔

[اچانک کھانسی کا دورہ شروع ہوجاتا ہے]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈان :۔

طربیہ موسیقی کی ایک لہر — فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی اختر اور دوستوں کے قہقہے۔

اختر :۔ (ہنستے ہوئے) اور رشید! تم بھی تو ایسے ہی تجربے سے گزر چکے ہونا!

رشید :۔ میں نے تو کان پکڑا اختر۔ وہ آدمی نہیں شک کی پوٹلی ہے۔ کمبخت اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرتا ہے۔

آفتاب :۔ ڈرنا بھی چاہیے۔ اکیلا آدمی ہے بیچارہ۔

[سب ایک ساتھ ہنس پڑتے ہیں]

اختر :۔ آفتاب نے اکیلے آدمی کی بھی خوب کہی۔ بھائی ہم سبھی اکیلے ہیں لیکن کسی کا دماغ اتنا تو خراب نہیں ہوا کہ دوستوں پر ذرا سا بھروسہ کرنے میں بھی تامّل ہو۔ اس نے مجیب سے یہ کہا کہ اسے میرے لفافے پر فارن کرنسی FOREIGN CURRENCY کا شبہہ ہوا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ میرے جاتے ہی کہیں دھر نا لیا جائے۔ بندۂ خدا۔ میں کہتا ہوں ایسا ہی ڈر تھا تو میرے جانے کے بعد لفافہ کھول کر دیکھ لیتا۔ میں نے اُسے مہر بند تو کیا نہیں تھا۔ ذاتی کاغذات تھے اور کیا۔ جی تو چاہا کہ بتا دوں۔ پھر سوچا کہ جب وہ ایسا ہی بے اعتبار سمجھتا ہے ہمیں تو جہنم میں جائے۔

رشید :۔ دیکھو برخوردار۔ کچھ بھی ہو وہ ہمارا دوست ہے۔ تمہیں بھی اس نے کھانا کھائے

بغیر واپس نہیں آنے دیا۔

اختر :۔ کھانا؟ وہ کھانا تھا؟

رشید :۔ پھر کیا تھا؟

آفتاب :۔ (جلدی سے) کتے کا راتب۔

اختر :۔ ارے کتے کا راتب بھی کچھ بہتر ہی ہوگا آفتاب۔ اُسے اپنے نوکر تک پر بھروسہ نہیں۔ ایک ایک چیز الماری میں بند۔ کھانے میں نمک کم تھا۔ پتا چلا نمک کی شیشی بھی مقفل کر دی گئی تھی۔

آفتاب :۔ اوہ تو تم نے نمک کم ہی کھایا۔ خیر۔ نمک حرام بننے سے بچے۔

رشید :۔ اور وہ مونڈھوں کا کیا قصہ تھا۔

اختر :۔ وہ اسٹور میں بند تھے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی سے۔

رشید :۔ خیر ہوگا۔ اب چھوڑو اس ذکر کو۔ اس کی زندگی اس کے ساتھ ہے۔ ہم سے کیا؟

اختر :۔ اب میں اس کے یہاں تھوکنے بھی نہ جاؤں گا۔ خدا کی قسم سخت توہین کا احساس ہوا ہے۔ آج تک ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

رشید :۔ بھائی وہ مریض آدمی ہے۔ اور مریض پر خفا نہیں ہوا کرتے۔ اس پر ترس کھانا چاہیے۔

آفتاب :۔ کیوں؟ ترس کیوں؟

رشید :۔ پھر اور کیا؟ وہ قصہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی تھا کہ ڈاکٹر سکینہ نے اسے اپنی مرضی سے دوسری بار VISIT کر لیا تو وہ اس شک میں گرفتار ہوگیا کہ وہ جان بوجھ کر اس کی بیماری کو طول دے رہے ہیں۔

آفتاب :۔ لیکن ایک بات ہے۔ کھلتا نہیں کبھی۔ میں نے اس کی زبان سے کبھی کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سنی۔ چھپا ہے ایک نمبر کا۔ دل کی دل ہی میں رکھتا ہے۔ کوئی بھید سامنے نہیں آنے پاتا۔

اختر :۔ کھُلے گا کیا۔ اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے۔ کسی پر اعتبار ہو۔ جب کھلے۔ ایک روز میں صبح صبح یوں ہی پہنچ گیا۔ وہ سمجھا قرض مانگنے آیا ہوں۔ لگا پہلے ہی سے تمہید باندھنے اور اپنی مجبوریوں کا رونا رونے۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی۔ لیکن وہ غبی بھی ہے۔ میرے ہنسنے پر بھی کچھ نہیں سمجھا۔

آفتاب :۔ اچھا رشید! ایک کام کیا جائے۔

رشید :۔ کیا؟

آفتاب :۔ چلو ہم دونوں کسی وقت اس کے پاس چلیں۔ اختر تو آج چلا ہی جائے گا۔ اس سے کہیں کہ اختر مجھے جو لفافہ دے گیا ہے اس میں کچھ نہایت خطرناک قسم کے کاغذ رکھے ہوئے ہیں۔ پھر وہ کم از کم اختر کے بارے میں کھل جائے گا۔

اختر :۔ اونہہ، بکواس۔ مجیب سے تو وہ اپنے شک کا اظہار کر ہی چکا ہے۔ پھر اس سے حاصل بھی کیا۔ ارے میاں وہ تو اپنے سگے خالو پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔ آج کل سخت برگشتہ ہیں وہ اس سے۔ کل مجھے مل گئے تھے۔ میں نے یوں ہی عرفان کا حال پوچھ لیا تو بڑے میاں چالو ہو گئے۔ کہنے لگے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجن چچا نے کسی روز اُسے ناشتے میں خاگینہ، پراٹھے اور سوجی کا حلوہ کھلا دیا تو اسے یہ شک ہو چلا کہ وہ اس سے کوئی کام نکالنا چاہتے ہیں۔ رشتے کی حرمت کا بھی خیال نہیں آتا اس کو۔ بیچارے مجن چچا بے حد افسردہ تھے۔

رشید :۔ خیر ہوگا۔ اب ختم کرو اس قصے کو۔ کان پک گئے اس کا ذکر سنتے سنتے۔ کیوں آفتاب؟

آفتاب :۔ تمھاری روانگی آج کس وقت ہے اختر!

اختر :۔ شام کے پانچ بجے۔ اب اٹھنا چاہیے۔ ابھی بہت سے کام سمیٹنے ہیں۔

آفتاب :۔ لیکن یار امریکہ جا کر اس اکیلے آدمی کو بھول نہ جانا۔

(سب ہنستے ہیں!)

فیڈ آؤٹ۔

فیڈان :۔

[صبح کے سات بجتے ہیں]

خالہ جان: (دور سے پکارتے ہوئے) نوید، خورشید، جمشید، سعید۔ اُفّوہ کوئی نہیں سنتا۔ (اور زور سے) ارے غلام بخش ــــ ارے او غلام بخش! کمبخت گز بھر کا تو نام ہے۔

غلام بخش :۔ (دور سے) آ رہا اؤں (آ رہا ہوں)

[بھاگتا ہوا آتا ہے]

خالہ جان :۔ ذرا دیکھو تو، یہ نوید، خورشید، جمشید، سعید سب کے سب کان میں تیل ڈالے پڑے ہیں۔ سورج سر پر آ گیا اور سب ابھی تک گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ غضب خدا کا۔ آٹھ بجے کا اسکول ہے۔ کب اٹھیں گے کب پہنچیں گے۔ اور ہاں! نوید کے ابا کہاں ہیں۔

غلام بخش :۔ بیٹھک میں ہیں۔ حقّہ بھر کر دے آیا ہوں۔ حریرے کو پوچھ رہے ہیں۔

خالہ جان :۔ (منہ بنا کر) حریرے کو پوچھ رہے ہیں۔ صبح سے چرخی کی طرح گھوم رہی ہوں۔ مجید اور رشید کو تو خیر سات بجے کی بس پکڑنی ہوتی ہے۔ انھیں کھلا پلا کر رخصت کیا۔ حمید اور وحید تو خیر نو بجے سے پہلے اٹھنے سے رہے۔ ذرا دیکھ تو ننھی سعیدہ اور فوزیہ اٹھ گئیں کہ نہیں۔ دس دس بچّوں کو سنبھالنا معمولی جگرے کے آدمی کے بس کی بات تھوڑی ہے۔ اور انھیں حریرے ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ میرا تو دماغ خراب ہو جائے تو کچھ دور نہیں۔ ایک کو انڈا چاہیے تو دوسرے کو انڈے کے نام سے متلی ہوتی ہے۔ تیسرے کو دودھ چاہیے تو چوتھا چائے کا رسیا ہے۔

خالو جان :۔ (اندر آتے ہوئے) کیا بات ہے بیگم۔ کیوں سرخ ہو رہی ہو صبح صبح۔

خالہ جان :۔ مجھے یہ چونچلے بھوٹ آنکھ نہیں بھاتے۔ تم جاؤ بیٹھک میں۔ حریرہ وہیں بھیج دوں گی۔ یہاں میرا دماغ نہ چاٹو۔ نوید، خورشید، جمشید اور سعید کا ناشتہ لگوا دوں تو حریرہ بناؤں۔

خالو جان :۔ لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں۔ رات میں نے بتایا تھا نا کہ مجھے آٹھ بجے تک اُن

کے یہاں پہنچنا ہے۔

خالہ جان:۔ اوہ! ابھی شیروانی ڈٹ رکھی ہے۔ خیر۔ میں ابھی تیار کیے دیتی ہوں تمھارا حریرہ۔

[دروازے پر دستک]

خالہ جان:۔ ارے غلام بخشے۔ بیٹا ذرا دیکھو تو کون ہے، صبح صبح دروازہ پیٹے ڈال رہا ہے۔

[غلام بخش دروازہ کھولتا ہے۔ پھر دوڑتا ہوا واپس آتا ہے]

غلام بخش:۔ بڑی بی بی ہیں۔

خالو جان:۔ کون؟ اچھن باجی!

خالہ جان:۔ (پکارتے ہوئے) آجایئے اچھن باجی۔ اپنے گھر میں بھی کوئی بھلا اجازت لے کر داخل ہوتا ہے۔ آیئے آیئے۔

خالو جان:۔ آداب۔

اچھن باجی:۔ آداب آداب۔ کیا حال ہے مجّن میاں؟

خالہ جان:۔ آداب اچھن باجی۔ خیریت تو؟

اچھن باجی:۔ جیتی رہو دلھن۔ خیریت ہی سمجھو۔ اور مجّن میاں! یہ صبح صبح کہاں کی تیاری ہے؟

خالو جان:۔ وہ جو نیم تلے والے تھانیدار ہیں نا، ارے بھلا سا نام ہے مصباح الحسن صاحب، ہاں، مصباح الحسن — ذرا ان ہی کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ ان کا بیٹا ابھی ڈاکٹری پاس کر کے لوٹا ہے۔ اپنا دواخانہ قائم کر لیا ہے اس نے۔ حکیم اچّن صاحب نے کل اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ مصباح الحسن صاحب اس کے لیے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ اور کیا لڑکا ہے اچھن باجی۔ نیک سیرت، نیک صورت، نیک ذات۔ پھر اپنے پیشے میں ایسا ماہر کہ بڑے بڑے سرجن کان پکڑتے ہیں۔ ابھی اس نے منشی عبداللطیف کی بیوی کا علاج کیا تھا۔ پھوڑا ہو گیا تھا۔ پیٹھ پر۔ بیچاری کو لیٹنا سونا دوبھر تھا۔ لیکن اس نے کیا چیرا لگایا ہے۔ دس منٹ میں کوئی آدھا سیر مواد بھل بھل باہر نکل آیا۔ اور کیوں نہ ہو۔ سائنس بڑی ترقی کر گئی

ہے۔ سنا ہے کوئی مشین ایسی بھی نکلی ہے جو آدمیوں کی طرح حساب کتاب کا کام بھی سنبھال لیتی ہے۔ فرنگی جو نہ کر ڈالیں تھوڑا ہے۔ عقل میں آگے نہ ہوتے تو ساری دنیا میں ان کا ڈنکا کیسے بجتا۔

خالہ جان:۔ (اکتاکر) چرخی چل پڑی تمہاری۔ ارے ذرا اچھن باجی کو دم تو لینے دو۔ میل بھر سے چلی آ رہی ہیں غریب۔ ہلکان ہو گئی ہوں گی۔ اور کیوں نہ ہوں۔ ہڈی چمڑا ایک ہو گیا ہے۔ کھانے پینے کی ہمیشہ سے دشمن۔ دونوں وقت ٹھنگے کے چار لقمے پیٹ میں ڈال لیے اور اللہ اللہ خیر صلاّ۔ لیکن اچھن باجی! آج تو آپ کو یہاں ناشتہ کرنا ہی پڑے گا۔

اچھن باجی:۔ میں ناشتہ کر کے آئی ہوں دلھن۔ مجبور نہ کرو۔ گھر میں تکلف کیسا۔ میں تو یوں آ گئی کہ کل سلطانہ ـــــ

خالو جان:۔ (گھبراکر) کیا ہوا سلطانہ کو۔ نصیبِ دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے نا ہماری بچی کی۔

اچھن باجی:۔ (ہنس کر) ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ وہ ہوا یہ کہ کل میں نے اکیلے میں اس سے عرفان کی بات چھیڑی۔ بتا دیا کہ اس کا ارادہ شادی بیاہ کا نہیں ہے۔ پہلے تو کچھ دیر گم سم سی رہی پھر آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لیکن میں بھی قول کی پکّی ہوں۔ پہلے تو جی میں آئی کہ ایک بار عرفان سے صاف صاف بات کر لینے میں کیا حرج ہے۔ پھر خیال آیا کہ ایک بار جو بات زبان سے نکل گئی اس کا پاس رکھنا فرض ہے۔ اب پھوٹی آنکھ سے بھی اس کی طرف نہ دیکھوں گی۔

خالو جان:۔ (جلدی سے) وہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا۔ میں تو اس بدبخت کی رگ رگ سے واقف ہو گیا ہوں۔

اچھن باجی:۔ ہاں تو میں نے سمجھایا سلطانہ کو۔ بڑی مشکل سے اس نے ہامی بھری۔ اب مجن میاں تم جو بھی مناسب سمجھو۔ تم کہہ رہے تھے نا کہ احمد علی صاحب کا لڑکا ـــــ

خالو جان:۔ (جلدی سے) آپ کی دعا سے لڑکوں کی کیا کمی ہے اچھن باجی اپنی سلطانہ کے لیے۔ احمد علی کا لونڈا ہے۔ مصباح الحسن صاحب کا بیٹا ہے جس نے ڈاکٹری کی دکان کھولی ہے۔

اور خوب چلا رہا ہے۔ ایک ایک دن میں سیکڑوں کے وارے نیارے ہوجاتے ہوں گے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کس کو چُنا جائے۔ میری نظر تو مصباح کے بیٹے پر جم گئی ہے۔

اچھن باجی:۔ لیکن اُس روز تو تم احمد علی صاحب کے بیٹے کا ذکر کر رہے تھے۔

خالو جان:۔ وہ تو ٹھیک ہے اچھن باجی! لیکن کہاں افیم کا انسپکٹر اور کہاں ایک کامیاب سرجن۔ اُس کی ایک مہینے کی تنخواہ اِس کے ہفتے بھر کی آمدنی۔ دیکھ لینا۔ سال دو سال میں کوٹھی کھڑی کرے تو کچھ تعجب نہیں۔ موٹر بھی خرید لے گا۔ سوچتا ہوں موٹر خرید لے تو اس کے یہاں شبیرے کے لونڈے کو ڈرائیور لگوا دوں۔ آخر ہمارے خاندان کا نمک خوار ہے۔ آج کل حالت ذرا پتلی ہے۔ خیر لڑکے کو موٹر چلانا سکھا دیا ہے۔ ٹرک تک کھینچ لیتا ہے پھر کار کی کیا بساط۔ مصباح الحسن کا بیٹا میری بات ٹال نہیں سکتا۔ لگوا دوں گا شبیرے کے لونڈے کو ڈرائیور۔ وہ بھی عیش کرے گا۔ اپنی سلطانہ اُس گھر میں پہنچ جائے گی تو اس کی خدمت میں خوش بھی رہے گا۔ پھر اعتبار کا آدمی ہے ورنہ آج کل کسی کا کیا ٹھیک ہے۔ موٹر کا ایک پرزہ ہی چرا کر بیچ دیا تو ہزاروں کے وارے نیارے ہو گئے۔

اچھن باجی:۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا بھیا۔ کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ۔ اب تم جانو۔ میرے لیے تو جیسے احمد علی ویسے مصباح الحسن۔ میں نہ انہیں جانوں نہ اُنھیں۔ میں نے تو ان کے بیٹوں کو بھی نہیں دیکھا۔

خالو جان:۔ دیکھیں گی تو جی خوش ہو جائے گا اچھن باجی۔ مصباح الحسن کا بیٹا تو آنکھوں میں کھب گیا ہے۔ میری نظر تو اس پر ہے اب۔ رہے احمد علی تو ان سے کوئی بہانہ کرنا پڑے گا۔ آخر کو تین پشت کے تعلقات ہیں۔ دکھ سکھ سب میں ایک دوسرے کے شریک ساجھے دار۔ یہ اپنی جگہ پر۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر کہ ہمیں تو اپنی بیٹی کا مستقبل دیکھنا ہے۔ یوں آپ کہیں تو میں کسی نہ کسی بہانے دونوں لونڈوں کو ایک ایک کر کے گھر بلوا لوں۔ مصباح الحسن کے بیٹے کو بلانا تو یوں بھی آسان ہے۔ کہ دوں گا

کہ بیگم کی حالت کچھ خراب ہے۔

خالہ جان :۔ (چمک کر، تُرج، حالت خراب ہو میرے دشمنوں کی۔ میں بھلی چنگی ہوں۔ مجھے ہوا کیا ہے۔ تمھاری طرح تو ہوں نہیں کہ ہر آئے گئے سے اپنی صحت کا دکھڑا روتی رہوں۔ تم خود ٹھہرے برسوں سے بیمار۔ قبض تو خیر سائے کی طرح ساتھ لگا ہے۔ پھر موئی چھالیہ کتھے کی عادت اور سب سے زیادہ یہ دھونکنی کی طرح دن رات حقّے کی بھق بھق، اس نے تمھیں کہیں کا نہ رکھا۔ دیکھنے سے برسوں کے بیمار لگتے ہو۔

خالو جان :۔ اری نیک بخت تم نے تو موازنۂ انیس و دبیر شروع کر دیا۔ میں تو اُسے بہانے سے بلانے کی بات کر رہا تھا۔ تم ٹھہریں پردے والی۔ زیادہ سے زیادہ نبض دیکھے گا۔ سو اس سے کیا۔ میں خود کو بیمار بتا کر بلواؤں تو بھید کھل جائے گا کہ ہو نہ ہو کچھ دال میں کالا ہے۔ خیر۔ میرا حریرہ تیار ہو گیا ہو تو لاؤ۔ میں ذرا مصباح الحسن صاحب کی خیر خبر تو لے آؤں۔ اور جب تک میں آ نہ جاؤں اچھن باجی کو جانے نہ دینا۔ میں کوئی گھنٹے بھر میں ضرور لوٹ آؤں گا۔ جب تک اچھن باجی کو ناشتہ کراؤ۔

خالہ جان :۔ (دیگچی میں چمچہ چلاتے ہوئے) یہ لو! بس پانچ منٹ میں تمھارا حریرہ تیار ہوا جاتا ہے۔ کہو تو کچھ دلیہ بھی نکال دوں۔

خالو جان :۔ نن نہیں۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ باقاعدہ ناشتہ میں لوٹ کر کر لوں گا۔ بس حریرہ۔

خالہ جان :۔ یہ لو۔

خالو جان :۔ بھئی واہ! کیا عمدہ مہک ہے اور کیوں نہ ہو۔ اور بادام میں ماتا دین کے یہاں سے لایا تھا۔ ہے تو گراں فروش لیکن مال اس کے یہاں ہمیشہ اوّل درجے کا ہوتا ہے۔

[شڑپ شڑپ پینا شروع کرتے ہیں۔]

پس منظر سے مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر۔

۔فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان :۔

[کال بیل بجتی ہے]

عرفان :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں کراہتے ہوئے) کون ہے بھائی۔ (اپنے آپ سے) یہاں کون آئے گا۔

[کال بیل پھر بجتی ہے]

عرفان :۔ آرہا ہوں — آیا۔ ابھی آیا۔

[کراہتا ہوا دروازے کی طرف جاتا ہے۔ دروازہ کھولتا ہے]

عرفان :۔ (حیرت سے) اختر تم ؟

اختر :۔ ہاں میں ہوں عرفان ! لیکن یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے ؟

عرفان :۔ (گھبرا کر) م م مجھے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ٹھیک ہوں۔ تم امریکہ سے کب لوٹے۔

اختر :۔ (سنجیدہ لہجے میں) کل دوپہر کو۔ اور کل ہی مجھے رشید اور آفتاب نے بتایا کہ تم بیمار ہو۔

عرفان :۔ (افسردہ لہجے میں) رشید اور آفتاب !

اختر :۔ ہاں ! تم اُن سے بے خبر رہے ہو گے لیکن وہ تم سے بے خبر نہیں تھے تم نے اُن سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ سو وہ بھی نہیں آئے۔ لیکن انھیں کسی نہ کسی ذریعے سے تمھاری خبر ملتی رہی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔

عرفان :۔ آؤ۔ اندر آؤ۔

[کراہتا ہوا واپس لوٹتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے اختر بھی اندر آتا ہے]

عرفان :۔ بیٹھ جاؤ۔

[اختر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے]

عرفان :۔ ہاں ! اور اب سناؤ اپنے سفر کا حال۔ کب لوٹے تم ؟

اختر :۔ یہ سوال تم دوسرے منٹ میں مجھ سے دوسری بار پوچھ رہے ہو۔ تم تو واقعی بیمار ہو۔ خاصے بیمار۔ لیکن کب سے ؟ یہ حالت کب سے ہوئی ہے ؟ اس کا اندازہ تو شاید رشید اور آفتاب کو بھی نہیں۔

عرفان :۔ کب سے ؟ کیا بتاؤں کب سے ؟ (بھرائی ہوئی آواز میں) شاید ازل سے۔ چاروں طرف خلا ہے۔ مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی نہیں۔ اور اب یہ سناٹا بہت

جان لیوا ہے۔

اختر :۔ (جذباتی لہجے میں) عرفان!

عرفان :۔ (افسردگی سے) تم بھی کیوں آ گئے اختر۔ تمھیں بھی مجھ سے دور ہو جانا چاہیے تھا، ہمیشہ کے لیے۔ میں نے تمھیں صدمہ پہنچایا۔

اختر :۔ اُس بات کو بھول جاؤ عرفان! مجھے ذرہ برابر اس کا خیال نہیں۔ دل میں اب ایسا کوئی احساس باقی نہیں رہا۔

عرفان :۔ (افسردگی سے ہنس کر) حیرت ہے۔ سخت حیرت ہے۔ سبھی تو دور ہو گئے۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے ناطے ٹوٹتے گئے۔ اور جب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ سب درست تھے اور غلط صرف میں تھا تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب تو سب اتنی دور جا چکے ہیں کہ واپسی ممکن نہیں۔ حیرت ہے کہ تم کیسے آ گئے۔

اختر :۔ عرفان! تم میرے دوست ہو عرفان!

عرفان :۔ (ہنس کر) دوست؟ اس لفظ کی توہین نہ کرو اختر۔ میں نے خود کو اس رشتے کی لذّت سے ہمیشہ محروم رکھا۔ اپنے آپ کو بھی اپنا دشمن بنا لیا۔ جبھی تو سارے دوست چھوٹ گئے۔ عزیز چھوٹ گئے۔ رشتے دار چھوٹ گئے۔ اور سلطانہ ـــ اس کی بھی شادی ہو گئی۔

اختر :۔ (حیرت سے) سلطانہ؟ کون؟

عرفان :۔ (ہنس کر) تم نہیں جانتے؟ جانتے بھی کیسے؟ میں نے کسی کو بتایا ہی کب تھا سلطانہ میرے لیے اماں مرحومہ سے ایک عہد کا نقشِ ناتمام تھی۔ سو یہ نقش ناتمام ہی رہا اور محرومی کے اس احساس نے مجھے یاد دلایا کہ میں خود کو بھی کتنی دور چھوڑ آیا ہوں۔ اختر! تم اس اذیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اماں مرحومہ کا چہرہ مجھے ہر رات خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ شکوے اور درد سے بھری ہوئی آنکھیں۔ منجمد آنکھیں۔ پتھرائی آنکھیں۔ لیکن ان میں کیسی قوت ہے؟ انوکھی اور ان جانی؟ جو مجھے زیر کیے دیتی ہے۔ وہ آنکھیں دن رات میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ شہر پناہ کے تمام دروازے

مجھے بند دکھائی دیتے ہیں اختر۔

اختر :۔ عرفان!

عرفان :۔ پریشان مت ہو اختر۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت کچھ کھونے کے بعد اب میں خود کو سمجھ سکا ہوں۔ واقعی اس طرح جینا کتنا مشکل ہے۔ جینے کا جو طور میں نے اختیار کیا تھا وہ کتنا غلط، کتنا مہلک اور کتنا مکروہ تھا۔ میں اس احساس کی اذیت سے پسا ہوا جا رہا ہوں۔ صرف اپنے سہارے زندہ رہنے کی خواہش، ایک پاگل اور پرفریب خواہش ہے۔

اختر :۔ عرفان — تمھیں ہو کیا گیا ہے عرفان؟

عرفان :۔ (ہنس کر) مجھے صحت ملی تو بیمار ہو گیا۔ جب تک بیمار تھا خود کو صحتمند تصور کرتا رہا۔ تم مجھے معاف کر دو اختر۔ معاف کر دو۔ اور رشید اور آفتاب سے کہنا کہ وہ بھی مجھے معاف کر دیں۔ اور اگر خالو جان کی طرف کبھی تمھارا جانا ہو تو ان سے بھی کہنا کہ مجھے معاف کر دیں اور سلطانہ سے اور اچھن پھوپھی سے بھی کہنا کہ مجھے معاف کر دیں۔ زندگی بعض حالات میں صرف ایک معذرت نامہ بن جاتی ہے۔

[افسردگی کے ساتھ ہنستا ہے]

عرفان :۔ حیرت ہے کہ تمھیں میری حالت پر ہنسی نہیں آتی۔ اختر۔ یہ کسی جذباتی ڈرامے کے کسی مصنوعی کردار کا تزکیہ نہیں، واقعہ ہے۔ واقعہ وہ ہے جو شاید تمھیں ڈرامہ نظر آتا ہو۔ خالو جان، خالہ جان، اچھن پھوپھی، سلطانہ — میرے لیے حقیقت اس وقت بنے جب خود اپنے آپ پر مجھے افسانے کا گمان ہونے لگا۔ اور اماں مرحومہ کی آنکھیں۔ اُن کے دام سے نکلنا محال ہے اختر۔

اختر :۔ خود کو سنبھالو عرفان! میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

عرفان :۔ اور یہ تم اس وقت کہہ رہے ہو جب میں تم سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں میرے دوست! مجھے اب معلوم ہوا کہ اعتبار کی قیمت کیا ہوتی ہے اور بے اعتباری کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اب درد کی اس زنجیر سے رہائی مشکل ہے۔

اختر :۔ زنجیر؟

عرفان :۔ ہاں! زنجیر۔ میں نے دو زنجیروں میں عمر بھر خود کو اسیر رکھا۔ پہلی زنجیر شک اور بے اعتباری کی کڑیوں سے میں نے آپ اپنے لیے بنائی تھی ۔ دوسری زنجیر درد اور نارسائی کے احساس کی پہلی زنجیر کا عطیہ ہے۔ یوں ہی زنجیروں میں عمریں گزر جاتی ہیں اختر۔

(افسردہ ہنسی۔ پھر ہنسی کی لے تیز ہوتے ہوتے تقریباً ہذیانی ہو جاتی ہے۔ پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی کی ایک طویل لہر۔)

۔ فیڈ آؤٹ ۔

ہم سفر

آوازیں

افسر : غصیلا نوجوان۔ رشید صاحب اور سعیدہ بیگم کا بڑا لڑکا۔
سعیدہ بیگم : رشید صاحب کی بیوی۔ ادھیڑ عمر۔ بیّ اور چڑچڑی۔
رشید صاحب : ادھیڑ عمر۔ جذباتی۔ خود پسند اور انتہائی باتونی۔
اختر : افسر کا چھوٹا بھائی۔ شریر۔ عمر دس برس کے لگ بھگ
نگہت : افسر کی چھوٹی بہن۔ عمر آٹھ نو برس۔ باتونی۔ شوخ۔
مجید چچا : رشید صاحب کے بڑے بھائی۔
دادی اماں : تنفس کی مریضہ۔ رشید صاحب اور مجید چچا کی ماں۔
نظام، توفیق : افسر کے دوست۔
میر صاحب : رشید صاحب کے پڑوسی اور ان کے ابا مرحوم کے دوست۔
خان صاحب، نسیم صاحب : رشید صاحب کے دوست۔
چپراسی۔

اناؤنسر کی آواز: (بھاری آواز۔ ڈرامائی لہجہ) ہر ساتھ چلنے والا مسافر ہم سفر نہیں ہوتا۔ ہم — اپنے اپنے ہم سفر ہیں۔ اپنے ساتھ، بس اپنے ساتھ چلنے کا قہر —— ایک عذاب۔ ہر کاندھے پر اپنی روح کا آسیب ہے — اس کہانی میں کوئی کہانی نہیں۔ اس ڈرامے میں کوئی ڈرامہ نہیں۔ زندگی یوں بھی گزرتی ہے، چپ چاپ، خاموش، گمبھیر۔ اور طوفان سمندر کی تہہ میں چھپے ہوتے ہیں۔

فیڈ ان : ابتدائی موسیقی — ۔ فیڈ آوٹ ۔

[موسیقی کی لہر جیسے ہی دھیمی ہوتی ہے پس منظر سے افسر کے گانے کی آواز ابھرتی ہے۔ غسل خانے میں نل سے پانی کی دھار کے گرنے کا شور۔ افسر نہاتے ہوئے کپکپاتی آواز میں رک رک کر گا رہا ہے۔ آواز کبھی دھیمی کبھی تیز —]

افسر : مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

[دروازے پر زوروں کی دستک]

مم — مدت ہوئی ہے — [گاتے گاتے رک جاتا ہے]

سعیدہ بیگم : اے ہے! میں کہتی ہوں تجھ میں تان سین کی روح سما گئی ہے کیا؟

افسر : (اندر سے) کُک! کیا بات ہے ممی —

سعیدہ بیگم : بات کیا ہے۔ کتنی بار کہا کہ یہ وقت ان کے سونے کا ہے۔ شور نہ مچنے پائے نہیں تو آنکھ کھلی اور میری جان کو آئے۔

افسر : (اندر سے ہنسی کی آواز) ارے تو میں کیا کر رہا ہوں؟

سعیدہ بیگم : ہے ہے! آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے اور پوچھتے ہو میں کیا کر رہا ہوں؟ غضب خدا کا صبح سویرے نہ اللہ نہ رسول۔ موئے شعر پڑھے جا رہے ہیں۔

افسر : (چیخ کر) اچھا اچھا ممی! اب چپ ہوا جاتا ہوں۔ ڈیڈی جاگے تو نہیں۔

سعیدہ بیگم : خدا نہ کرے۔ کہیں جاگ گئے ہوتے تو میری مصیبت آجاتی۔ رات دو کے بعد آنکھ لگی ہے۔ اٹھتے ہی چائے مانگیں گے۔ پھر دفتر جانے سے پہلے لنچ — دن بھر پھرکی کی طرح گھومتی رہتی ہوں۔ گھر کے دھندے کرستے ہی نہیں۔

[بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے]

۔فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان :

اختر : (چیختے ہوئے) نکالو میری کاپی۔ تم ہی نے اٹھائی ہوگی یہاں سے۔

نگہت : اچھا تو پھر میں نے ہی اٹھائی ہے۔ جاؤ۔

اختر : جاؤں کہاں نگہت کی بچی!

نگہت : جہاں جی چاہے اختر کے بچے۔

اختر : (غصے میں) پھر زبان لڑائی۔ کھینچ لوں گا گدی سے ابھی۔

نگہت : (روہانسی ہو کر) میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی۔

اختر : بڑی آئی ڈیڈی کی بچی!

نگہت : تم بڑے آئے ممی کے بچے ۔

اختر : (جھپٹ کر) بتاتا ہوں ابھی ۔ بتاتا ہوں ۔

نگہت : (چیخ کر پکارتے ہوئے) ڈڈڈیڈی ۔۔ ڈیڈی ۔

[اختر نگہت کی پٹائی شروع کر دیتا ہے ۔ نگہت بیچ بیچ میں چلاتی جاتی ہے " ڈیڈی ۔۔ اوف ۔۔ ڈیڈی " سعیدہ بیگم بھاگی ہوئی آتی ہیں ۔]

سعیدہ بیگم : ہائیں ہائیں ! یہ کیا ۔ ارے چھوڑ اسے کم بخت ۔ کیا جان ہی لے لے گا ۔ سو رہے ہیں ابھی ۔ آنکھ کھل گئی تو ایک ایک کا بھرتہ بنا دیں گے ۔ تم سب پر خدا کا قہر ٹوٹے ۔ ہزار بار سمجھایا کہ صبح سویرے جب تک وہ دفتر نہ چلے جائیں دماغ سہی رکھا کرو تم سب ۔ لیکن میری کون سنتا ہے ۔۔

افسر : (قریب آتے ہوئے) کیا ہوا ممی ؟

سعیدہ بیگم : ہوا کیا ؟ وہی جو روز ہوتا ہے ۔ اختر تھوڑا شریر تو ہے ہی ۔ لیکن یہ نگہت کی بچی بھی کچھ کم نہیں ۔ ذرا سا اس نے ہاتھ لگایا اور بتاشے کی طرح بکھر گئی ۔

[بیچ بیچ میں نگہت کی سسکیاں]

افسر : (ڈانٹ کر) کیوں اختر ! تم نے آج پھر نگہت کو مارا ؟

[نگہت اب زور زور سے رونے لگتی ہے]

اختر : (بسورتے ہوئے) میں تو اس سے بس اپنی کاپی مانگ رہا تھا ۔

افسر : کاپی ؟ کیسی کاپی ؟

سعیدہ بیگم : ارے چھپا دی ہوگی اس نے کہیں ۔ بس دیکھنے میں بھیگی بلی ہے ۔ یہ لڑکی فتنہ ہے فتنہ !

[نگہت اور زور زور سے رونے لگتی ہے]

موسیقی کی ایک لرزہ خیز لہر ۔

رشید صاحب : (دور سے جمائیاں لیتے ہوئے) مشتاق ! او مشتاق کے بچے !

مشتاق : (دور سے) آیا صاحب!

[بھاگتا ہوا جاتا ہے]

سعیدہ بیگم : (خوفزدہ لہجے میں) اب آئی مصیبت ۔ اللہ تم سب مل کر مجھے جینے نہ دو گے ۔

افسر : کیا بات ہے ممی؟

سعیدہ بیگم : (کانپتے ہوئے لہجے میں) بات کیا ۔۔ ؟ وہ جاگ گئے ۔۔ جاگ گئے وہ ۔ ابھی مشتاق کو آواز دے رہے تھے ۔۔ جاگ گئے وہ ۔۔ جاگ گئے ۔ اللہ، اب کیا ہوگا؟

[کھانسی کا دورہ پڑجاتا ہے ۔]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈ ان :

[رات کا سناٹا ۔ دور کتوں کے بھونکنے کا شور ۔ دو بجتے ہیں ۔]

[دادی اماں دھیرے دھیرے کراہ رہی ہیں ۔ پھر اٹھ بیٹھتی ہیں ۔ اچانک سانس کی رفتار تیز ہوجاتی ہے ۔]

مجید چچا : (چونک کر) اماں ۔ اماں!

دادی اماں : (کراہتے ہوئے) ہاں بیٹے ۔ (ہانپنے لگتی ہیں ۔)

مجید چچا : آپ ابھی سوئیں نہیں!

دادی اماں : (ذرا ٹھہر کر) اب تو بیٹا! بس یہ دعا ہے کہ اللہ ہمیشہ کی نیند سلا دے ۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے ؟ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ۔ اب مر کر ہی سکون ملے گا ۔

مجید چچا : یہ کیسی باتیں کرتی ہیں آپ ۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے ۔

دادی اماں : اب تو اپنا سایہ بھی برا لگتا ہے بیٹے ۔ (ہانپنے لگتی ہیں)

مجید چچا : پانی لاؤں : پانی ۔

دادی اماں : (کمزور آواز میں) پانی ۔

[مجید چچا جلدی سے اٹھ کر پانی کے لیے جاتے ہیں ۔ صراحی سے گلاس میں پانی بھرتے ہیں ۔ اچانک گلاس ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ۔۔ چھناکے کی آواز]

دادی اماں : (خوفزدہ ہوکر) اللہ! کہیں وہ جاگ گیا تو مصیبت آجائے گی۔

سعیدہ بیگم : (دور سے) کون ہے؟ کون ہے؟

[اٹھ کر مجید چچا کی طرف آتی ہیں۔]

مجید چچا : (دھیرے سے) یہ میں ہوں دولھن!

سعیدہ بیگم : کون؟ مجید بھائی؟ کیا ہوا؟

مجید چچا : اماں کے لیے پانی انڈیل رہا تھا۔ گلاس ہاتھ سے پھسل پڑا۔

سعیدہ بیگم : دیکھیے گا۔ کہیں کرچیاں تلووں میں نہ چبھ جائیں۔ آپ ننگے پانو ہیں۔

مجید چچا : ننگے پانو؟ اوہ ہاں! چپلیں اس خیال سے نہیں پہنیں کہ کہیں رشید میاں کی آنکھ نہ کھل جائے۔

سعیدہ بیگم : وہ تو جاگ رہے ہیں ابھی۔

مجید چچا : (ڈر کر) جاگ رہے ہیں۔

سعیدہ بیگم : ہاں! وہی جاسوسی قصے پڑھے جارہے ہیں۔

مجید چچا : اور آپ؟

سعیدہ بیگم : (ٹھنڈا سانس لے کر) میں بھی جاگ رہی ہوں مجید بھائی۔ وہ سوجائیں تو میں بھی دو چار جھپکیاں لے لوں گی۔

مجید چچا : لیکن دو بج چکے ہیں دولھن۔

سعیدہ بیگم : وہ تو روز ہی بجتے ہیں مجید بھائی۔ اچھا۔ ٹھہریے! میں دوسرا گلاس لاتی ہوں۔ اماں کو پانی چاہیے نا؟

مجید چچا : (دھیرے سے) ہاں۔ وہ پیاسی ہیں شاید!

[حزینہ موسیقی]

۔ فیڈ آؤٹ۔

فیڈان :

[افسر ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتا ہے۔ پھر گنگنانا شروع کرتا ہے۔]

افسر : (دھیمے سُروں میں) مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

[دروازے پر دستک]

افسر : (چونک کر) کون؟ (وقفہ) کون صاحب ہیں؟
نظام : وہی جس کے تم منتظر ہو!
افسر : اوہ! نظام! تم؟ (اٹھ کر دروازہ کھولتا ہے)
نظام : (اندر آتے ہوئے) توفیق بھی ہے۔
توفیق : (تمسخر کے ساتھ) یہ نیاز مند آداب عرض کرتا ہے۔ آداب عرض ہے افسر صاحب!
افسر : (جلدی سے ہنس کر) اوہ! آؤ آؤ۔

[سب بیٹھ جاتے ہیں اور سگریٹ سلگاتے ہیں]

نظام : یہ تم گھر میں کیوں گھسے بیٹھے ہو؟ چلو! اٹھو!
افسر : کہاں؟
توفیق : اجی حضور گھر سے باہر اور کہاں؟
افسر : (دھیرے سے) گھر سے باہر؟
نظام : ہاں!
افسر : کچھ دیر تو بیٹھو!
توفیق : لیکن ایک شرط ہے۔
افسر : کیا؟
توفیق : حضور چائے پلوانے کا بندوبست فرمائیں۔
افسر : اوہ، چائے، ہاں ہاں: میں ابھی کہہ کر آتا ہوں!

[کمرے سے نکل کر جاتا ہے۔ چند ثانیوں کے بعد واپس آتا ہے]

افسر : میں ذرا کپڑے بدل لوں!

نظام : اب ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ پہلے چائے تو پلادو۔
افسر : (افسردگی سے) چائے، چائے بھی پلا دوں گا۔ پیراڈائز میں!
توفیق : کیوں؟ حضور کے دولت کدے پر چائے کا انتظام دشوار ہے کیا؟
افسر : (کھوئے کھوئے سے انداز میں) دولت کدہ! گھر؟ میرا گھر؟
نظام : (حیرت سے) ارے، یہ تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟
افسر : پریشان! میں پریشان ہوں؟ اوہ کوئی بات نہیں۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔
توفیق : دیکھیے حضور! یہ خاکسار چائے تو یہیں پیے گا۔ سمجھے۔
افسر : اوف فوہ! ارے بھائی، باہر پی لوگے تو کون سی قیامت آجائے گی!
نظام : ہاں ہاں! باہر ہی چلتے ہیں۔ اٹھو توفیق!
توفیق : دیکھیے نظام صاحب! یہ ناچیز تو چائے گھر ہی میں پیے گا۔ سمجھے۔
افسر : گھر؟ گھر؟ گھر؟
نظام : (چونک کر) افسر؟ افسر؟ کیا بات ہے افسر؟
توفیق : (سنجیدگی سے) افسر؟
افسر : (درد بھرے لہجے میں) میرا کوئی گھر نہیں، ہمارا کوئی گھر نہیں، یہ گھر صرف ــــ
توفیق : (جلدی سے) میں شرمندہ ہوں افسر! تمھیں ناحق تکلیف پہنچی۔ لیکن آخر بات کیا ہے؟
افسر : کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ چلو باہر چلتے ہیں۔

[سب ایک ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ افسر زور سے دروازہ بند کرتا ہے۔ ملے جلے قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جاتی ہے۔]

۔فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان:

[باورچی خانے کی کھٹ پٹ]

سعیدہ بیگم : (منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے) غضب خدا کا، ایک اکیلی جان اور اس پر جہان بھر کی مصیبتیں۔ فجر کے وقت سے اب تک دم لینے کی مہلت نہیں ملی۔ صبح کی چائے۔

پھر ناشتہ، پھر لنچ۔ خدا خدا کر کے اب گھر سے رخصت ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے یہ فرمائش کہ رات کے کھانے پر دو مہمان بھی ہوں گے۔ انھیں کھلاؤں کیا اپنا سر؟ لالہ نے ادھار دینے سے منع کر دیا۔ گوشت کہاں سے منگواؤں؟ جلیل کو ابھی پہلے کے بیس روپے دینے ہیں۔ اپنی بوٹیاں نوچ کر کھلا دوں کیا؟ گھر کی خیر نہ خبر بس حکم داغ دیا۔ رات کے کھانے پر دو مہمان ہوں گے۔ مر بھکّے، جب دیکھو چلے آ رہے ہیں ندیدوں کی طرح — اپنے بچّوں کا پیٹ کاٹ کر مہمانوں کی تواضع کروں۔ میرے خدا۔

دادی اماں: دلھن، او دلھن!

سعیدہ بیگم: (رک کر) جی اماں!

دادی اماں: بیٹا وہ خمیرہ منگوا لیا تھا جبار صاحب کی دوکان سے۔

سعیدہ بیگم: کس منہ سے منگواؤں۔ ابھی پچھلے مہینے کا حساب بیباق نہیں ہوا ہے۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔ بھلے آدمی ہیں زبان سے نہیں کہتے۔ لیکن آنکھیں سب کچھ اگل دیتی ہیں۔ ابھی کل صبح ہی کی تو بات ہے۔ میں نگہت کے ساتھ ان کی دکان پر گئی تھی۔ دھاگے کی ریلیں خریدیں۔ پیسے مانگے تو نہیں بس اتنا کہا — حساب میں لکھ لوں یہ بھی — گھڑوں پانی پڑ گیا مجھ پر۔ جی چاہا ڈوب مروں۔ اللہ، ایسی بھی کیا رسوائی۔

دادی اماں: جانے دو بیٹا! ہلکان مت ہو۔ اب تو میرا جی بھی ٹھیک ہے پہلے سے۔

سعیدہ بیگم: (دور سے) ہاں اماں! اور کیا کہہ سکتی ہیں آپ، سوائے اس کے کہ —

دادی اماں: سعیدہ! دلھن!

سعیدہ بیگم: آپ کا تو خون ہے، اماں! آپ سب کچھ سہہ لیں گی اور اف نہ کریں گی۔ ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے۔ (روہانسی ہو کر) مجھے بھی اپنی فکر نہیں۔ فکر ہے افسر، نگہت اور اختر کی۔ افسر نے کل رات سے کھانا نہیں کھایا۔ خدا جانے کہاں مارا مارا پھرا کرتا ہے۔ موئی ہوٹل بازی کی چاٹ پڑ گئی تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔ دو مہینے سے

اسے جیب خرچ نہیں ملا۔ نگہت اپنی فرمائشیں کسی نہ کسی طرح پوری کرا لیتی ہے۔
اختر کب سے گیند بلے کے لیے ضد کر رہا ہے۔ اس مہینے ردّی بکی تو سوچا کہ دلا دوں۔
لیکن اسی روز وہ موئے نسیم صاحب ٹپک پڑے۔ حکم ہوا مرغ منگوالوں۔

دادی اماں: (اکتا کر) جانے دو دُلھن۔ تم بھی گڑے مردے اکھاڑنے لگیں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔
ابھی مجید میاں سے کہ کر منگوالوں گی۔ یوں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔

سعیدہ بیگم : مجید بھائی! وہ بیچارے کہاں سے لائیں گے۔ جو کچھ جمع پونجی تھی کب کی اڑ چکی ——
مجید بھائی بیچارے پائی کو ترستے ہیں اور وہ ہیں کہ اس حرام شئے کے لیے ——

دادی اماں: (تنبیہہ کے انداز میں) دُلھن!

سعیدہ بیگم : کہ لینے دیجیے اماں کہ لینے دیجیے۔ میرا دل اب پتھر ہو چکا ہے۔ آپ بھی اندر ہی اندر
گھٹتی رہتی ہیں۔ جی کی بھڑاس تو نکل جائے۔ کہ نہیں سکتیں تو سن ہی لیجیے اماں!

دادی اماں: (اسی انداز میں) دُلھن!

سعیدہ بیگم : (روہانسی ہو کر) تباہ ہو گیا یہ گھر۔ برباد ہو گیا۔ اجڑ گیا۔ اس موئی حرام شے نے۔
کیا کہوں! جب سے منہ کو لگی ہے ——

دادی اماں: دلھن!

[سعیدہ بیگم اچانک رونے لگتی ہیں۔ پس منظر سے حزنیہ موسیقی کی ایک
لہر — فیڈ آؤٹ۔]

فیڈ ان :

[نگہت اور اختر کے ملے جلے قہقہے]

نگہت : (ہنستے ہوئے) پھر، پھر کیا ہوا بھائی جان؟

اختر : وہ جو نسیم چچا ہیں نا! وہ تو چپ چاپ لیٹ گئے۔ سر میں زوروں کی چوٹ لگی تھی۔

نگہت : اور ڈیڈی!

اختر : ڈیڈی اپنی ہانکے جا رہے تھے۔ انھیں شاید پتا بھی نہیں چلا۔ اور پھر بتاؤں نگہت؟

نگہت : بتایئے!

اختر : ڈیڈی بولے — میں نے اتنے تھپڑ رسید کیے، اتنے تھپڑ رسید کیے کہ ان صاحب کا منھ سرخ ہوگیا۔
نگہت : تو کیا پھر نسیم چچا پر ہاتھ پڑا؟
اختر : نہیں۔ اس بار وہ کرسی کے ہتھے پر ایک دھپ جما بیٹھے۔
نگہت : (ہنس کر) پھر؟
اختر : پھر کیا! ڈیڈی کو بھی چوٹ لگی۔ اتنے میں نسیم چچا کو غصہ آگیا۔ پھر وہ جیسے ہی اٹھے اور ڈیڈی کی طرف گھور کر دیکھا، ڈیڈی گھبرا گئے۔ لگے مشتاق کو پکارنے۔
نگہت : پھر کیا ہوا؟
اختر : مشتاق بھاگا بھاگا آیا۔ نسیم چچا ٹھیک سے چل ہی نہیں پا رہے تھے۔ ڈیڈی بولے۔ رکشہ لاؤ!
نگہت : پھر، پھر کیا ہوا؟
اختر : مشتاق رکشہ لایا۔ پھر نسیم چچا کو ہولڈال کی طرح اٹھا کر رکشے پر ڈال دیا۔

[دونوں ہنس پڑتے ہیں۔]

افسر : (قریب آتے ہوئے) یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم دونوں!
نگہت : (دھیرے سے) چپ ہو جاؤ اختر بھائی۔ افسر بھیا آگئے۔
اختر : افسر بھیا!
نگہت : ہاں!

[افسر قریب آتا ہے]

افسر : یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو یہاں؟ جاؤ باہر کھیلو!

[نگہت ہنس پڑتی ہے]

افسر : بڑی ہنسی آئی جا رہی ہے۔ آخر بات کیا ہے؟
نگہت : (اختر سے) بتا دوں، بتا دوں بھیا کو؟
اختر : (تنبیہہ کے انداز میں) نگہت!

افسر : (ڈانٹ کر) بتانے دو اسے، کیا بات ہے ؟

نگہت : (جلدی سے) وہ جو نسیم چچا ہیں نا ؟

افسر : ہاں ہاں :

نگہت : کل رات ڈیڈی نے انھیں پیٹ دیا۔

افسر : پیٹ دیا !

[نگہت منھ دبا کر ہنسنے لگتی ہے]

افسر : کیوں اختر ؟ کیا ہوا تھا !

اختر : کل شام وہ آئے تھے، ڈیڈی کے پاس۔

افسر : ہاں ہاں ! پھر ؟

اختر : ڈیڈی انھیں اپنی بہادری کا قصہ سنا رہے تھے کہ کس طرح انھوں نے ایک مسافر کی پٹائی کر دی تھی۔

افسر : مسافر ؟

اختر : ج جی ہاں۔ وہ ڈیڈی پچھلے ہفتے دلّی گئے تھے نا ؟

افسر : ہاں :

اختر : راستے میں کسی مسافر سے ان کی لڑائی ہو گئی تھی۔ ڈیڈی نے وہی قصہ چھیڑ رکھا تھا۔ مسافر کی پٹائی کا حال بتاتے بتاتے ایک ہاتھ نسیم چچا کے سر پر جڑ دیا۔

افسر : (ہنسی روک کر) پھر ؟

اختر : پھر کیا ؟ نسیم چچا پہلے تو چپ چاپ لیٹ گئے۔ پھر شاید کچھ سوچ کر انھیں بھی غصہ آگیا — جیسے ہی انھوں نے ڈیڈی کی طرف آنکھ نکال کر دیکھا، ڈیڈی جلدی سے مشتاق کو آواز دینے لگے۔

افسر : کیا اس وقت وہ — ؟

اختر : (جلدی سے) ہاں دونوں جنے شراب پی رہے تھے۔ وہی لال لال شربت جسے ڈیڈی دوا کہتے ہیں۔

افسر : (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں! (اپنے آپ سے) تو اب وہ تھوڑی دیر بھی کسی کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ پھر، پھر وہ لوگ جن کا رات دن کا ساتھ ہے اور جنھیں ساتھ ساتھ زندگی کا سفر کرنا ہے، ان کے لیے۔

سعیدہ بیگم : (دور سے) افسر! او افسر!

افسر : آیا ممی!

[بھاری قدموں سے چلا جاتا ہے]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈ ان :

[میر صاحب زمین پر چھڑی ٹیکتے ہوئے دھیرے دھیرے آتے ہیں ۔]

میر صاحب : (کھنکھار کر) مجید میاں! ارے بھئی مجید میاں!

مشتاق : (اندر سے) آیا صاب! (بھاگتا ہوا آتا ہے)

میر صاحب : کون! مشتاق؟ مجید میاں ہیں گھر میں؟

مشتاق : جی ہاں، ہیں تو!

میر صاحب : کیا کر رہے ہیں آخر؟

مشتاق : نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

میر صاحب : اچھا تو جا! بتا دے انھیں کہ میں آیا ہوں!

مشتاق : جی میر صاحب! آیئے، اندر آیئے۔

[میر صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے اندر جاتے ہیں۔ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں ۔]

[دور سے آتی ہوئی آوازیں ــــ]

رشید صاحب : کیوں مشتاق کیا بات ہے؟

مشتاق : وہ آئے ہیں، کیا نام ہے میر صاحب!

رشید صاحب : میر صاحب! صبح صبح کہاں ٹپک پڑے ۔

مشتاق : بڑے صاحب کو پوچھ رہے ہیں۔
رشید صاحب: کسے ؛ مجید بھائی کو۔
مشتاق : جی صاحب!
رشید صاحب: اچھا تو ان سے کہ دے۔ لیکن مجھے پوچھیں تو یہ مت کہیو کہ جاگ رہا ہوں۔
مشتاق : جی صاحب۔ تو بڑے صاحب سے کہ دوں۔
رشید صاحب: ہاں۔ پہلے انھیں میرے پاس بھیج دے۔

[مشتاق جاتا ہے۔ پھر مجید میاں آتے ہیں]

رشید صاحب: مجید بھائی!
مجید چچا : کیا ہے رشید میاں؟
رشید صاحب: وہ میر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہی چکر ہوگا۔ افسر کے رشتے کا۔ آپ بات کر لیجیے۔
مجید چچا : اوں ہاں! (آگے بڑھ جاتے ہیں)
مجید چچا : (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) اخاہ! میر صاحب! آداب عرض۔
میر صاحب: خوش رہو بیٹے! آؤ! بیٹھو!

[مجید میاں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں]

میر صاحب: مجید میاں!
مجید چچا : جی میر صاحب!
میر صاحب: وہ بات یہ ہے کہ افسر کے سلسلے میں ——
مجید چچا : ہاں ہاں! کیا ہوا؟
میر صاحب: بہتر ہوتا کہ رشید میاں بھی آجاتے تو بات ختم ہو جاتی۔
مجید چچا : (گڑبڑا کر) رشید۔ اوہ رشید تو ابھی سو رہے ہیں۔
میر صاحب: سو رہے ہیں؟ (حیرت سے) سو رہے ہیں ابھی تک؟ ارے میاں دوپہر ہونے کو آئی۔ آج دفتر نہیں جانا کیا؟

مجید چچا : کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ چھٹی لے لی ہو گی۔
میر صاحب : (کچھ سوچ کر) میاں برا نہ مانو تو ایک بات کہوں !
مجید چچا : جی؟
میر صاحب : میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ اگر تم سب مجھے غیر نہیں سمجھتے تو ـــــ
مجید چچا : ارے یہ خیال آپ کے ذہن میں آیا کیسے۔ آپ تو ابا مرحوم کی جگہ ہیں۔
میر صاحب : خوش رہو مجید میاں، خوش رہو۔ یہ تمھاری سعادت مندی ہے۔
مجید چچا : آپ کچھ کہہ رہے تھے۔
میر صاحب : ہاں! وہ بات یہ ہے کہ میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ اس کا رنگ ڈھنگ مجھے کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دیتا۔ تمھارے ابا مرحوم نے آنکھ بند کرنے سے پہلے تمھارے سروں پر میرا ہاتھ رکھا تھا۔
مجید چچا : وہ بات یہ ہے میر صاحب کہ ـــــ
میر صاحب : (جلدی سے) مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں مجید میاں۔ تم نے تو خیر اپنی زندگی اس گھر کے لیے مٹا دی۔ شادی نہیں کی۔ اپنی ذات کو ایک دم بھلا دیا۔ مجھے تو ترس آتا ہے تمھاری بوڑھی ماں اور تمھارے بھتیجے بھتیجیوں پر۔ سعیدہ بیگم کا حال بھی کچھ چھپا نہیں ہے۔ گھر کی بات کسی نہ کسی راستے باہر پہنچ جاتی ہے۔
مجید چچا : (رکتا رکتا) آپ افسر کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔
میر صاحب : پہلے مجھے اپنی بات تو پوری کر لینے دو میاں! رشید کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ آخر تم ان سے بڑے ہو نا! میری عادت نہیں کہ دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ اڑاؤں۔ لیکن اس گھر سے میرا بھی کچھ تعلق ـــــ ہے کہ نہیں۔
مجید چچا : وہ تو ہے ہی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میر صاحب!
میر صاحب : تو میرے عزیز! اسی تعلق کی بنیاد پر کچھ کہہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا بال بال قرض میں بندھ چکا ہے۔ یہ کالی صدی ہے۔ اچھے اچھوں کے دن بگڑ گئے۔ پھر ہم تم کس شمار میں؟

مجید چچا : (دھیرے سے) جی!

میر صاحب: لیکن رشید نے یہ کبھی نہ سوچا! تمھیں پتا ہے کہ تمھارے ابا مرحوم کی موت کے بعد تم دونوں کی تعلیم تک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تم تو خیر گھر بیٹھ رہے۔ رشید میاں کو یتیم خانے کے سپرد کر دیا گیا۔

مجید چچا : (دھیرے سے) اوہ ہاں! وہ بات یہ ہے کہ کہیں رشید میاں تک آپ کی آواز نہ پہنچ جائے۔

میر صاحب: (قدرے تلخ ہو کر) ان تک کسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ نہیں تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ خدا نے انھیں عقل دی تھی۔ محنت کر کے جوں توں تعلیم پوری کر لی۔ پھر نوکری بھی مل گئی۔ لیکن جب سدھرنے کے دن آئے تو حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

مجید چچا : (دھیرے سے) جی!

میر صاحب: میں یہ سب تمھیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں مجید میاں! خدا کے لیے یہ نہ سوچنا۔ اس گھر کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

مجید چچا : جی!

میر صاحب: رشید میاں کو اپنے عیش و آرام سے غرض ہے۔ گھر والے فاقے کریں، بچے ذرا ذرا سی چیزوں کو ترسیں، اماں کو دوا نہ ملے، بیوی نوکروں کی طرح دن رات کام میں جتی رہے۔ کچھ نہیں، کسی بات کا احساس نہیں!

مجید چچا : (خوفزدہ لہجے میں) میر صاحب!

میر صاحب: (آواز تیز ہو جاتی ہے) گھبراؤ نہیں مجید میاں۔ وہ ابھی سو رہے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ وہ جاگنے سے ڈرتے ہیں کہ انجھنیں ان کا ہاتھ نہ پکڑ لیں۔

مجید چچا : (کانپتی ہوئی آواز میں) میر صاحب!

میر صاحب: کہہ لینے دو مجھے مجید میاں۔ میرا دل دکھتا ہے ان کی حرکتوں پر۔ تمھارے ابا مرحوم نے سوکھی روکھی کھائی لیکن عزت سے گزار دی۔ رشید میاں اپنی جھوٹی عزت کے لیے گھر بھر کو سوکھی روکھی کھلا رہے ہیں۔ اور یہی کیا! انھیں بھوکوں مرنا پڑے جب

بھی رشید میاں کے کان پر جوں نہ رینگے گی۔ انھیں اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ اپنے شراب کباب کی فکر۔

مجید چچا : اب بس کیجیے میر صاحب، بس کیجیے۔

میر صاحب: (ہانپتے ہوئے) میں جانتا ہوں کہ تمھیں یہ سب کچھ معلوم ہے۔ لیکن جان کر تم سب ان جان بنتے ہو۔ اور اس مروت کے ہاتھوں تم اپنے آپ کو بھی تباہ کر بیٹھے ہو۔

مجید چچا : (جذباتی لہجے میں) چپ ہو جائیے میر صاحب، چپ ہو جائیے۔ اب نہیں سنا جاتا۔

میر صاحب: (کرخت لہجے میں) نہیں! تمھیں سننا ہوگا۔ سمجھے۔ تمھیں پتا ہے میں آج کتنا دکھی ہوں؟

مجید چچا : (حیرت سے) جی؟

میر صاحب: سلامت بھائی نے رشتے سے انکار کر دیا۔

مجید چچا : کیوں؟

میر صاحب: انھیں افسر سے کوئی شکایت نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسے پسند کرتے ہیں — لیکن رشید میاں، خدا کی پناہ! آخر لڑکی کو اس گھر میں رہنا ہے!

مجید چچا : وہ تو ٹھیک ہے لیکن!

میر صاحب: لیکن کیا؟ رشید میاں اس خاندان کے سب سے بڑے "لیکن" ہیں۔ نگہت کی بچپن کی منگنی ٹوٹ گئی۔ اختر کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ افسر گھر سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ اور اس ساری تباہی کا سبب بس ایک ہے۔ وہی ایک۔

مجید چچا : (زچ ہو کر) لیکن کیا کیا جائے میر صاحب؟ رشید میاں گھر تو چھوڑنے سے رہے۔

میر صاحب: میں یہ کب کہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنا طور کچھ بدل لیں۔ حرام چیز کی لت ہے! اس لت کو چھوڑ نہیں سکتے تو کم از کم اتنا کریں کہ اس کے مصارف کا بار گھر پر نہ ڈالیں۔ ماشاء اللہ اچھی خاصی تنخواہ اور گھر کی یہ حالت۔

مجید چچا : تو سلامت چچا نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟

میر صاحب: قطعی ہی سمجھو۔ وہ جان بوجھ کر تو اپنی بیٹی کو اس جہنم میں جھونکنے سے رہے۔

مجید چچا : ٹھیک ہے (دھیرے سے) میں رشید میاں سے ذکر کر دوں گا۔

میرصاحب :۔ فضول! بالکل فضول! انھیں اس بات سے کیا دلچسپی ہوگی۔ دلچسپی اسے ہوتی ہے جسے گھر کی عزّت کا کچھ پاس ہو۔

مجید چچا :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اب کیا بھی کیا جائے؟

میرصاحب :۔ (ڈرامائی انداز میں) پانی مرے او نچا ہوچکا ہے مجید میاں۔ کوئی دم میں اس خاندان کی عزّت، شرافت، روایت، وقار سب کچھ ڈوب جائے گا۔ سب کچھ برباد ہوجائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ برباد ہوچکا۔ خیر! میرا کام تھا تمھیں باخبر کرنا۔ اب تمھارے سوچنے کی بات ہے۔ میں جاتا ہوں۔

[میرصاحب اٹھتے ہیں۔ فرش پر چھڑی ٹیکتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔ چھڑی کی ٹک ٹک کی آواز دھیرے دھیرے معدوم ہوتی جاتی ہے۔]

"۔ فیڈ آؤٹ ۔"

فیڈان :

(لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر ــــ موسیقی کی ــــ لہر دھیمی ہوتے ہی سعیدہ بیگم کی سسکیاں ابھرتی ہیں۔)

سعیدہ بیگم :۔ کیا کروں، اللہ، میں کیا کروں؟ کیسے سمجھاؤں تمھیں۔

افسر :۔ (غصیلے لہجے میں) آپ یہ زحمت نہ فرمائیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس زحمت کا خیال ہی چھوڑ دیں۔

سعیدہ بیگم :۔ افسر!

افسر :۔ جی ممّی! میں آپ کے سامنے ہوں۔

سعیدہ بیگم :۔ پھر تم سمجھتے کیوں نہیں بیٹے؟

افسر :۔ کیا سمجھوں؟ بتایئے۔ اس گھر کو یوں ہی تباہ ہوجانے دوں۔ بولیے! اس کی اینٹیں بجوا دوں؟ بچا کھچا اثاثہ بازار بھجوا دوں؟ ایں؟ جواب دیجیے۔

سعیدہ بیگم :۔ میں کیا بتاؤں بیٹے! تم بچے تو نہیں جو خود نہ سمجھ سکو!

افسر :۔ تو پھر مجھے کہنے دیجیے۔ کہنے دیجیے کہ یہ گھر گھر نہیں جہنّم ہے۔ میں یہاں اپنے دوستوں کو ایک پیالی چائے نہیں پلا سکتا، ڈیڈی کے ڈر سے۔ میں یہاں باتیں نہیں کر سکتا، ڈیڈی کے ڈر سے۔ نگہت کی پالنے کی منگنی ٹوٹ گئی، ڈیڈی کی وجہ سے۔ اختر کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، ڈیڈی کی وجہ سے۔ دادی اماں کی دوا نہیں آسکتی، ڈیڈی کی وجہ سے۔ آپ نے زندگی کے ہر سکون سے ہاتھ دھو لیا ہے، ایک ڈیڈی کی وجہ سے۔

سعیدہ بیگم :۔ افسر!

افسر :۔ اب خود کو بہلاوے نہ دیجیے ممّی! نہ یہ کہیے کہ وہ اس گھر کے مالک ہیں، آخر مجید چچا بھی تو ہیں۔ کبھی ان کی زندگی کے بارے میں بھی سوچا ڈیڈی نے۔

سعیدہ بیگم :۔ (ملتجیانہ انداز میں) افسر! میری جان!

افسر :۔ (جذباتی ہو کر) دیکھیے ممّی! آپ کا دل دکھا ہوا ہے۔ میں آپ کو اور زیادہ دُکھ نہیں پہنچانا چاہتا۔

سعیدہ بیگم :۔ (روہانسی آواز میں) پھر چپ ہو جاؤ بیٹے چپ ہو جاؤ!

افسر :۔ اگر! اگر میرے چپ ہو جانے سے یہ گھر سدھر جائے تو میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاؤں!

سعیدہ بیگم :۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) کیوں منحوس کلمہ زبان پر لاتے ہو بیٹے! خدا نہ کرے،

افسر :۔ (جذباتی ہو کر) پھر، پھر مجھے کہنے دیجیے ممّی: آج میں ان سے باتیں کروں گا۔ نہ جانے کب سے سینے میں لاوا دہک رہا ہے۔ میں اندر ہی اندر پگھلتا جا رہا ہوں۔ دوست ہماری ہنسی اُڑاتے ہیں۔ محلّے والے، بازار والے، عزیز رشتے دار، سب ہم پر ہنستے ہیں۔ ایک ایک کر کے سب ہم سے بچھڑ گئے۔ سب دور ہو گئے۔

سعیدہ بیگم :۔ (جذبات سے مغلوب ہو کر) میں سلامت بھائی کے آگے جھولی پھیلا دوں گی بیٹے! اُن کی منّتیں کروں گی تمھارے لیے بلقیس کو مانگوں گی۔ میں جاؤں

گی ان کے پاس اور انھیں اپنی زندگی کا واسطہ دوں گی بیٹے! بلقیس تم سے دور نہ ہوسکے گی۔

افسر:۔ (دھیمے لہجے میں) بلقیس! بلقیس! مجھے بلقیس سے زیادہ اس گھر کا خیال ہے ممی! اگر بلقیس کو کھو کر مجھے یہ گھر مل جائے تو میں ——

سعیدہ بیگم:۔ (جلدی سے) افسر! میرے بیٹے!

افسر:۔ کتنے پردے ڈال رکھے ہیں انھوں نے اپنی زندگی پر۔ دنیا کی آنکھیں اندھی تو نہیں ہیں۔ آپ انھیں سمجھاتیں کیوں نہیں؟

سعیدہ بیگم:۔ کیسے سمجھاؤں بیٹے، کیسے سمجھاؤں؟

افسر:۔ ایسی زبان میں جو اُن کی سمجھ میں آسکے۔ نہیں تو پھر مجھے سمجھانے دیجیے۔

سعیدہ بیگم:۔ کک! کیا کہوگے ان سے؟

افسر:۔ وہی جو حقیقت ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ نکہت کی منگنی صرف ان کی بدمزاجی کی وجہ سے ٹوٹی۔ اختر کا دل تعلیم سے صرف ان کی وجہ سے ہٹ گیا۔ دادی اماں کے لیے دوا صرف ان کی بے حسی کے سبب نہیں آسکتی۔ آپ کی یہ حالت صرف ان کی وجہ سے ہے۔ بولیے۔ جواب دیجیے۔ کیا یہ غلط ہے۔

سعیدہ بیگم:۔ سچ ہے۔ سب کچھ سچ ہے مگر۔

افسر:۔ مگر کیا۔ کہ دیجیے کہ آپ بزدل ہیں۔ ہم سب بزدل ہیں۔ اور ہماری اسی بزدلی نے ڈیڈی کو ایک لمحے کے لیے بھی سچائی کی طرف مڑنے نہیں دیا۔

سعیدہ بیگم:۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں بیٹے! سب کچھ جانتے ہیں۔

افسر:۔ پھر تو وہ مجرم ہیں۔ اگر انسان جان بوجھ کر یہ سب کرتا ہے تو پھر اُسے معاف نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی تنخواہ سولہ سو روپے ہے۔ لگ بھگ ایک ہزار تنہا ان کی ضرورتوں کی نذر ہوجاتے ہیں۔ تین سو مکان کا کرایہ۔ باقی بچے تین سو روپے۔ اس میں آٹھ انسانوں کا پیٹ بھر سکتا ہے؟

سعیدہ بیگم:۔ جانے دو بیٹے جانے دو!

افسر:۔ کب تک، آخر کب تک؟ انھیں اس گھر میں عزیزوں کی آمد پسند نہیں ۔
اس لیے کہ ان پر خرچ کرنا پڑے گا۔ میرے دوستوں کی آمد پسند نہیں کہ
ان کی ضیافت میں دو چار روپے خرچ نہ ہو جائیں۔ دادی اماں کے علاج
سے دلچسپی نہیں کہ دوا مفت نہیں ملتی۔ ملازمہ کو رخصت کر دیا گیا کہ اسے تنخواہ
دینی پڑتی تھی اور آپ سے سارا کام مفت چل جاتا ہے۔

سعیدہ بیگم:۔ افسر! (روکر) افسر! چپ ہو جاؤ! اب چپ ہو جاؤ!

افسر:۔ (اسی رو میں) مجید چچا کی پانوں کی عادت کا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ یہ خرچ بھی
کسی طرح بچ جائے، اور یہ سب صرف اس لیے کہ ان کے معمولات میں
فرق نہ آنے پائے۔ ان کی شامیں خراب نہ ہوں۔ انھیں اپنی سہولت اور عیش
کا ہر سامان ملتا رہے۔ روز شام کو بازار کا چکر لگانے کی ضرورت نہ ہوتی تو
مشتاق کی بھی چھٹی کر دی جاتی۔ مشتاق یہاں صرف اس لیے ہے کہ انھیں اس
کی ضرورت ہے۔

سعیدہ بیگم:۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) میں کہوں گی ان سے۔ آج ہی کہوں گی بیٹے،

افسر:۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کبھی نہ کہیں گی۔ گیلی لکڑی کی طرح یوں ہی سلگتی رہیں گی۔
ان کے سامنے آپ کی زبان بند رہے گی۔ ہونٹوں پر شکایت کا ایک بھی حرف
نہ آئے گا۔ مجھے معلوم ہے۔

سعیدہ بیگم:۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) نن نہیں! اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں آج ہی ان سے
باتیں کر دوں گی۔ سب کچھ کہہ دوں گی۔ سب کچھ۔ (رو پڑتی ہیں۔)

[حزینہ موسیقی] ــــــــــ فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان:
ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

رشید صاحب:۔ (ریسیور اٹھا کر) ہلو۔ رشید اسپیکنگ!

خاں صاحب:۔ (فون پر آتی ہوئی آواز) اوہ! تم آج دفتر آئے ہو!

رشید صاحب :۔ ہاں! پچھلے دو دن بڑی الجھنیں رہیں۔
خاں صاحب :۔ کیوں؟ کیا ہوا تھا؟
رشید صاحب :۔ والدہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ رات بھر ان کے ساتھ جاگنا پڑا۔
تنفس کی شکایت ہے انھیں۔ ادھر تکلیف بڑھ گئی تھی۔
خاں صاحب :۔ اوہ! VERY SAD ۔ پھر علاج کس کا ہو رہا ہے؟
رشید صاحب :۔ ڈاکٹر ماتھر کا۔
خاں صاحب :۔ اوہ! HOW SAD ۔ ماتھر تو بہت EXPENSIVE ہے۔
رشید صاحب :۔ وہ تو ہے، لیکن، کیا کیا جائے۔ ماتھر کے باپ ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے۔
اماں کو ان کے سوا کسی پر اعتقاد نہیں۔
خاں صاحب :۔ اوہ! پھر آج شام بھی تم خالی نہیں ہو!
رشید صاحب :۔ کیوں؟
خاں صاحب :۔ سوچا تھا تمھاری طرف آؤں۔ نسیم کو بھی بلایا جائے۔ کچھ گپ شپ رہے گی۔
رشید صاحب :۔ (ایک لمحے کے توقف کے بعد) ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ پھر سات بجے تک؟
خاں صاحب :۔ YES
رشید صاحب :۔ ٹھیک ہے۔ میں منتظر رہوں گا۔ (ریسیور کریڈل پر رکھ دیتے ہیں)
(دروازے پر دستک)
رشید صاحب :۔ کم ان پلیز؟
نسیم صاحب :۔ (اندر آتے ہوئے) آداب عرض ہے۔
رشید صاحب :۔ اوہ نسیم! آؤ آؤ!
نسیم صاحب :۔ (بیٹھتے ہوئے) کیا بات ہے رشید! کچھ پریشان نظر آ رہے ہو!
رشید صاحب :۔ اوہ! کوئی خاص بات نہیں۔ بس یوں ہی کچھ گھریلو الجھنیں تھیں
نسیم صاحب :۔ کیوں؟ کیا ہوا؟
رشید صاحب :۔ وہ میرے چھوٹے صاحبزادے ہیں نا! اختر میاں! ان کی ضد ہے کہ اس

اسکول میں نہیں پڑھیں گے۔ صاحب! جب سے تعلیم عام ہوئی ہے اسکولوں کا وہ معیار تو رہ نہیں گیا۔ ہمارے زمانے میں تعلیم صرف شرفا تک محدود تھی۔ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں ایک تو مولوی صاحب آتے تھے، قرآن پڑھانے۔ پھر ابّا مرحوم نے ایک انگریز گورنس کا انتظام بھی کر دیا تھا کہ مناسب تربیت ہو جائے۔ اسکول کا ماحول اس لیے اچھا تھا کہ وہاں ایروں غیروں کا گزر نہ تھا۔

نسیم صاحب:۔ (لڑکتے ہوئے) تو پھر کیا انتظام کیا آخر کا؟

رشید صاحب:۔ سوچتا ہوں اگلے سال انھیں دون اسکول بھیج دوں۔ جب تک کے لیے گھر پر ہی کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔ کوئی اچھا ٹیوٹر مل جائے تو ــــ میرا خیال ہے دو سو روپے میں مل جائے گا کوئی اچھا ٹیوٹر!

نسیم صاحب:۔ دو سو روپے؟ یہ تو بہت زیادہ ہیں بھئی!

رشید صاحب:۔ زیادہ ہیں؟ ارے بھئی اب وہ زمانے گئے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ بچّوں کی تعلیم بہتر سے بہتر ہونی چاہیے، خواہ تھوڑی تکلیف ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے اس کے لیے۔ بھئی اب روپیوں کی قیمت کیا رہ گئی ہے۔ تنخواہ تو صرف میرے اوپر کے خرچ کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ کوئی دو ہزار ماہانہ آبائی جائداد سے مل جاتے ہیں۔

نسیم صاحب:۔ آبائی جائداد؟

رشید صاحب:۔ ہاں ہاں! ابّا مرحوم نے تین کوٹھیاں دی ہیں اور ایک علی گڑھ میں چھوڑی ہیں۔ ان کا مجموعی کرایہ اتنا ہو جاتا ہے۔ آج اگر وہ کوٹھیاں نئے سرے سے اٹھائی جائیں تو دو گنے کرایے پر اٹھیں گی۔ لیکن۔

نسیم صاحب:۔ لیکن کیا؟

رشید صاحب:۔ کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ٹھہرا قلندر آدمی! مجھے زندگی میں پیسے کبھی عزیز نہ رہے۔ ایسا نہ ہوتا تو دیہات کی جائداد اعزا کے حوالے نہ کر دی ہوتی۔ وہاں سے ہر فصل پر بس دو تین ہزار آجاتے ہیں۔

اماں کے ڈلی پان کا خرچ اس سے پورا ہو جاتا ہے ۔ بقیہ سب کچھ عزیزوں کو دے دیا ہے ۔ مجید بھائی بھول کر بھی کبھی دیہات کا رخ نہیں کرتے ۔

نسیم صاحب :۔ بھئی لیکن اس زمانے میں ایسی بے نیازی بھی ۔

رشید صاحب :۔ (جلدی سے) بے نیازی کیا ؟ یہ تو اپنی فطرت بن چکی ہے ۔ میرا اصول ہمیشہ زندگی میں یہ رہا کہ جہاں تک ہو سکے گھر والوں ، دوستوں اور عزیزوں کی دل جوئی ہوتی رہے ۔ ایک زمانے میں ہمارے دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے ۔ آج بس اجلا خرچ چل جاتا ہے کسی طرح یہ بھی بہت ہے ۔ ہوس ، لالچ ، ریاکاری فریب ان سے طبیعت ہمیشہ متنفر رہی ۔ ایسا نہ ہوتا تو گھر بیٹھ کر عیش کرتے ۔ مجھے یہاں جتنی تنخواہ ملتی ہے اس سے زیادہ تو ابا مرحوم تعلقے کے کارندوں میں ہر ماہ تقسیم کر دیتے تھے ۔

(اچانک فون کی گھنٹی بجتی ہے)

رشید صاحب :۔ ہلو ! رشید اسپیکنگ ۔

مجید چچا :۔ (فون پر دور سے آتی ہوئی آواز) اوہ رشید میاں !

رشید صاحب :۔ جی ! کیا بات ہے ۔

مجید چچا :۔ اماں کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے ۔

رشید صاحب :۔ پھر ؟ (ناگواری سے) میں کیا کروں ؟

مجید چچا :۔ واپسی میں ان کی دوا لیتے آنا ۔

رشید صاحب :۔ وہیں کسی سے کیوں نہیں منگوا لیتے ؟

مجید چچا :۔ یہاں کا حال تمھیں معلوم ہے ۔ آج صبح سے ــــــ

رشید صاحب :۔ (جلدی سے) میں کیا کروں ، بتایئے ۔ وہیں افسر کو بھیج کر منگوا لیجیے ۔ یا خود چلے جایئے ۔ اور یہ مشتاق کا بچہ کہاں مر گیا ؟ بتایئے ۔ مجھے اتنا موقع کہاں ہے ۔ اور ہاں ! ذرا سعیدہ سے کہیے گا کہ شام کے کھانے پر خاں صاحب اور نسیم صاحب بھی ہوں گے ۔

مجید چچا :۔ لل لیکن ۔
رشید صاحب :۔ (جلدی سے) جی نہیں، آپ وہیں کسی کو بھیج دیجیے ۔ سمجھے ۔ [ریسیور کریڈل پر ٹپک دیتے ہیں]
نسیم صاحب :۔ کیوں ؟ کیا بات ہے ؟ کس کا فون تھا ؟ کوئی خاص بات ؟
رشید صاحب :۔ خاص بات کیا جان ضیق میں ہے ۔ مجید بھائی کا فون تھا ۔ ہماری بوا بیمار ہو گئی ہے ۔ اس کی دوا کے لیے کہہ رہے تھے ۔ میں نے کہا وہیں کسی سے منگوا لیں ۔ اور ہاں ۔ آج شام کو خاں صاحب سات بجے آ رہے ہیں ۔ تم بھی ساتھ ہو گے ۔
نسیم صاحب :۔ کوئی تقریب ؟
رشید صاحب :۔ تقریب کیا ؟ کچھ دیر غپ شپ رہے گی ۔ بھئی اپنی زندگی میں اب اور رہ بھی کیا گیا ہے ؟ میں نے عزت نفس کے تحفظ کی خاطر بڑے صدمے جھیلے ہیں ۔ اگر دنیا داری کا فن آتا ہوتا تو آج ایک سے ایک نالایق مجھ سے بہتر جگہوں پر کیوں ہوتا ۔ میں اپنی قلندری میں خوش ہوں ۔ عمر گزر گئی دوسروں کے لیے ایثار کرتے ہوئے ۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔ لیکن یہ سر کسی کے آگے خم نہ ہوا ۔ پھر اس کی قیمت تو ادا کرنی ہی تھی ۔
نسیم صاحب :۔ (اکتا کر) تو پھر شام کو ؟
رشید صاحب :۔ ہاں ہاں ۔ سات بجے تک ۔ منافقت اختیار کی ہوتی تو یہ حال کیوں ہوتا ۔ جس دفتر میں کام کرتے ہوئے بیس برس گزر چکے آج وہیں لوگ یہ الزام رکھتے ہیں کہ میں کام میں جی نہیں لگاتا ۔ جس شخص نے بیس برس تک بے لوث خدمت کی ہو، تمھیں معلوم ہے میں نے اس محکمے کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ۔ اب اگر میں دوسروں کی خاطر خود کو بہت سی ذمے داریوں سے الگ کر لوں تو یہ شکوہ شکایت کیا معنیٰ ؟
نسیم صاحب :۔ کیوں ؟ کیا ہوا ؟
رشید صاحب :۔ ہوا کیا ؟ اب کام سے طبیعت اچاٹ ہو چکی ہے ۔ ایک زمانے میں مجھے

کام کا بھوکا تھا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ کیا کیا منصوبے تیار کیے میں نے۔ ان پر اگر عمل کیا گیا ہوتا تو اس محکمے کی آج حالت ہی کچھ اور ہوتی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ دوسروں کو بھی کام کا موقع ملنا چاہیے۔ سو میں الگ ہوا جاتا ہوں۔ اس پر لوگ کہتے ہیں کہ میں صرف باتیں کرتا ہوں۔ مفت کی تنخواہ لیتا ہوں۔

نسیم صاحب:۔ (اکتا کر) اچھا تو پھر سات بجے۔ اب چلتا ہوں!

رشید صاحب:۔ ارے بیٹھو ابھی۔ چائے منگواتا ہوں۔ (گھنٹی بجاتے ہیں) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس محکمے میں اگر تمھیں کچھ زندگی نظر آتی ہے تو وہ اسی خاکسار کے خونِ جگر کا فیضان ہے۔

[چپراسی اندر آتا ہے۔]

چپراسی:۔ یس سر!

رشید صاحب:۔ چائے ـــــ (چپراسی چلا جاتا ہے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زندگی ایثار اور بے نفسی سے عبارت رہی۔

نسیم صاحب:۔ وہ افسر کے رشتے کا کیا ہوا؟

رشید صاحب:۔ (غصے میں) لعنت بھیجو اس پر۔ وہ سلامت صاحب گھاس چر گئے ہیں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے ان کا۔ ان کے یہاں رشتے سے میرا کیا بنتا۔ ان کی عزت بڑھ جاتی۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے جہیز سے نفرت ہے۔ اس قلندر کو جو کچھ میسّر ہے وہی بہت ہے۔ مجھے اور کچھ نہ چاہیے۔

نسیم صاحب:۔ میں نے سنا تھا کہ انھوں نے کہیں اور بات طے کر لی۔

رشید صاحب:۔ کر لی ہو گی۔ افسر جیسا لڑکا انھیں کہیں مل جائے تو جانوں۔ میں نے اپنی حیثیت کے لوگوں کو نظر انداز کر کے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا، محض اس لیے کہ لڑکی قبول صورت تھی، شائستہ تھی، گھریلو تھی۔ ہمارے یہاں لاکھ نئی تہذیب کے رنگ ڈھنگ آ گئے ہوں، ابھی قصباتی شرافتوں اور روایتوں کا کچھ اثر باقی ہے۔ اماں

کو ان کی لڑکی پسند آگئی تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی ہاتھ آیا موقع کھو بیٹھتا ہے، تو وہی ان کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کیں تو میں نے انکار کر دیا۔

نسیم صاحب :۔ انکار کر دیا۔

رشید صاحب :۔ ہاں! صاف انکار کر دیا۔ جسٹس بدرالدین اپنی بیٹی کے لیے دسیوں چکر غریب خانے کے لگا چکے ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت منتیں کرتے کرتے تھک گئے۔ لیکن۔

[چپراسی چائے کی ٹرے لے کر اندر آتا ہے]

رشید صاحب :۔ رکھ دو! اور جاؤ!

چپراسی :۔ جی صاحب! (چلا جاتا ہے۔)

نسیم صاحب :۔ تو پھر آج شام کو سات بجے۔

رشید صاحب :۔ ہاں ہاں سات بجے۔ لیکن چائے تو ختم کر لو۔

[چند ثانیوں کی خموشی۔ دونوں چائے پیتے ہیں]

نسیم صاحب :۔ اچھا! تو میں چلتا ہوں۔

رشید صاحب :۔ اچھا!

[نسیم صاحب باہر نکل جاتے ہیں۔ قدموں کی چاپ دور ہوتی جاتی ہے۔]

۔فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان :

[حزینہ موسیقی کی ایک لہر ـــ موسیقی کی لہر رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی جاتی ہے اور افسر کی آواز ابھرتی ہے۔]

افسر :۔ (اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے) جی چاہتا ہے وہ ساری آگ جو سینے میں چھپی ہوئی ہے، اگل دوں۔ یہ در و دیوار جن میں پچیس برس گزر گئے، لیکن جو رفاقت کی خوشبو سے خالی ہیں، یہ گھر جو گھر نہیں، یہ رشتے جو رشتے نہیں، کب تک روح کا

آزار بنے رہیں گے ۔ آخر کب تک ؟ ایک شخص کہ خوابوں میں جیتا ہے ، اس نے کتنی کڑوی ، مکروہ اور المناک حقیقتیں کانٹوں کی طرح ہمارے راستے میں بچھادی ہیں ۔ وہ اپنے ذلیل خوابوں ، اور کمینی خصلتوں کو سینے سے لگائے ہنس رہا ہے ، خوش ہے اس بات پر کہ وہ زندگی سے مسرتوں کا قطرہ قطرہ نچوڑ لینے کا ہنر جانتا ہے ، وہ سب کچھ جانتا ہے ، لیکن کچھ بھی نہیں جانتا ۔ وہ سب سے بے خبر ہے ، صرف اپنے آپ سے باخبر ——— [ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتا ہے ۔]

[باہر قریب آتی ہوئی قدموں کی چاپ]

توفیق :- (باہر سے) ارے بھئی افسر میاں ! افسر !

(افسر دروازہ کھولتا ہے ۔)

توفیق : (ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے) تم اکیلے اس کمرے میں بند ہو ؟

افسر : ہاں ! باہر کچھ بھی نہیں توفیق !

توفیق : کیا مطلب ؟ کچھ بھی نہیں ؟

[دور سے ملے جلے قہقہوں کا شور]

توفیق : تم روندھی صورت لیے کمرے میں پڑے ہوئے ہو ۔ باہر کیسی چہل پہل ہے ۔ چچا کی محفل جمی ہوئی ہے کیا ؟

افسر : ہاں ! اور اس سجے ہوئے کمرے سے باہر اس مکان کی دیواروں میں جدھر نگاہ اٹھاؤ گے تمھیں بے ترتیبی دکھائی دے گی ۔

توفیق : تم کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہے ہو !

افسر : ہاں ! ڈیڈی نے قہقہوں کی ڈھال ہم سب سے چھین لی ہے ۔ تم سوچتے ہوگے ، یہ کتنی بری بات ہے کہ میں اُس شخص کو جس نے مجھے نام دیا ، اتنی نفرت ، شدید نفرت کے ساتھ کیوں یاد کرتا ہوں ۔

توفیق : (سنجیدہ لہجے میں) مجھے پتا ہے افسر ! میں جانتا ہوں !

افسر : تم صرف جانتے ہو۔ اور میں وہ سب کچھ بھگت رہا ہوں۔ زندگی کے دو چار دن نہیں، بلکہ پوری زندگی جھوٹے قہقہوں کے ساتھ گزار دینا، کیا تم اسے انسانی عمل کہہ سکتے ہو۔

[پس منظر سے ملے جلے قہقہوں کا شور]

افسر : مجھے ڈستی ہیں یہ آوازیں۔ لگاتار ڈس رہی ہیں اور میری رگوں میں لہو کے بجائے صرف زہراب کی گردش ہے۔

توفیق : تم اتنا اثر کیوں لیتے ہو ان باتوں کا؟ افسر؟

افسر : ایں۔ کیا کہا؟ اثر نہ لوں۔ آخر میرے پاس کون سی ڈھال ہے۔

[پس منظر سے قہقہوں کا شور]

افسر : سنو! جی چاہے تو سن لو! اور دیکھو مجھے کہ میں دن رات یہی سنتا رہتا ہوں! اور زندہ ہوں!

[ہوا کا ایک پرشور جھونکا۔ دور سے آتی ہوئی آوازیں]

رشید صاحب : سمجھے خاں صاحب! یوں ہوتا ہے ہمارے علاقے میں۔ میں کتنی بار کہہ چکا آپ سے۔ کبھی چلیے دو چار روز کے لیے۔ ابا مرحوم نے شکار گاہ میں ایک مستقل انتظام کر رکھا تھا۔ اب تو خیر وہ دن رہ نہیں گئے۔ پھر بھی۔ وہ عمارت ابھی موجود ہے اور علاقے کے لوگ، بتائیں گے آپ کو کہ اس قلندر نے کیا کیا خرمستیاں کی ہیں جو ان کے دلوں میں۔

[ہوا کا جھونکا]

افسر : سنا تم نے! سب جھوٹ، سفید جھوٹ۔ ہمارے دادا تحصیل میں عرضی نویسی کیا کرتے تھے اور گزر مشکل سے ہوتا تھا۔

[ہوا کا جھونکا۔ دور سے آتی ہوئی آواز۔]

رشید صاحب : اور نسیم! ہماری بندوقیں تو کب کی ضبط ہو چکیں۔ والد سیاسی آدمی تھے۔ تقسیم کے بعد طرح طرح کے شبہے ان پر کیے گئے۔ چار تو ر ائفلیں تھیں۔

شکار کھلانے کے لیے ایک پورا عملہ تھا۔ بھئی اب کہاں سے ان کا پیٹ بھروں۔
دیہات کی ساری جائداد، زمینیں، باغات، عزیزوں میں تقسیم کر دیں

[موسیقی کی ایک لہر]

افسر : (ہانپتے ہوئے) حد ہوتی ہے بے غیرتی کی۔ جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ ہمارے پاس کبھی کوئی زمین نہیں رہی سوائے اس مکان کے، کوئی جائداد نہیں رہی۔

[ہوا کا ایک پرشور جھونکا۔ اچانک دور کہیں کانچ کے کسی برتن کے ٹوٹنے کی آواز ــــ]

افسر : آتا ہوں! ابھی آتا ہوں ــ (بھاگتا ہوا اندر جاتا ہے)

مجید چچا : (گھبرا کر) گلاس اچانک ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

افسر : کیا بات ہے مجید چچا؟

مجید چچا : کچھ نہیں بیٹے، اماں پیاسی تھیں۔

افسر : دادی اماں!

مجید چچا : ہاں! انھیں کے لیے صراحی سے پانی انڈیل رہا تھا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

افسر : ممی کہاں ہیں؟

مجید چچا : باورچی خانے میں۔ رشید میاں کے دوست آئے ہیں نا! ان کے لیے کھانا تیار ہو رہا ہے۔

افسر : کھانا؛ پیسے کہاں سے آئے؟

مجید چچا : پپ پیسے؟

افسر : (طنزیہ لہجے میں) اوہ آپ مت بنائیے، میں سمجھ گیا۔ آپ کی گھڑی کیا ہوئی۔

مجید چچا : گھ گھڑی؟

افسر : (طنزیہ) ضرورت بھی کیا ہے آپ کو۔ وقت یوں ہی اپنی چال چلتا رہے گا۔ آپ کو اس سے کیا لینا۔

مجید چچا : افسر! بیٹے! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اوہ! میں اب تک اماں کے لیے پانی نہیں لے گیا۔

[بھاری قدموں سے چلے جاتے ہیں۔]

دور سے آتی ہوئی آواز :

رشید صاحب : مشتاق! اے او مشتاق کے بچے!

مشتاق : (دور سے) آیا صاحب!

رشید صاحب : کھانا لگ گیا؟

مشتاق : (قریب آتے ہوئے) جی ابھی لگ جاتا ہے!

رشید صاحب : حرام خور، کتنی دیر سے کہہ رہا ہوں۔ جا بوا سے کہہ دے کہ جلدی کریں۔

مشتاق : (حیرت سے) بوا؟

رشید صاحب : دفعان ہو جا یہاں سے اور جلدی کر۔

[مشتاق بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے۔]

افسر : ممی! ممی!

[باورچی خانے میں برتنوں کی کھنک]

سعیدہ بیگم : ہاں بیٹے۔

افسر : (قریب جاکر) توفیق بیٹھا ہوا ہے۔ چائے مل سکتی ہے؟

سعیدہ بیگم : چائے! ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ لیکن بیٹے ذرا باہر کھانا لگوا دوں پہلے!

مشتاق : (قریب آکر) بیگم صاحب ذرا جلدی کر دیں۔ صاحب بگڑ رہے ہیں۔

سعیدہ بیگم : (بڑبڑاتی ہوئی) غضب خدا کا۔ آدمی ہوں۔ مشین نہیں ہوں۔ مجید بھائی اماں کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔ مشتاق کو بازار بھیج دیا، وہی حرام شے منگوانے کے لیے۔ مرغ ذبح کیے۔ بوٹیاں نکالیں۔ کھانا پکنے میں آخر کچھ وقت لگتا ہے۔ دو ہاتھوں سے کیا کیا کروں؟

رشید صاحب : (دور سے) مشتاق! ابے او مشتاق کے بچے!

مشتاق : (بھاگتا ہوا) آیا صاحب !

سعیدہ بیگم : کان کے پردے پھٹ جائیں گے سنتے سنتے ۔ دو منٹ صبر نہیں کر سکتے ۔

افسر : (طنز سے) صبر کرنے کے لیے آپ جو ہیں !

سعیدہ بیگم : (روہانسی ہو کر) میرا جی تنگ نہ کرو بیٹے ! اس وقت تو چپ رہو !

افسر : (چیخ کر) پھر کس وقت بولوں ! آخر کس وقت ؟ اور وہ لفظ کہاں سے لاؤں جو ان کی سمجھ میں آ سکیں ۔ کہیے تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں !

سعیدہ بیگم : گھر !

افسر : (متاسفانہ لہجہ) نہیں ۔ میں نے غلط کہا ۔ یہ گھر نہیں ہے ۔ جہنم ہے ۔ لیکن کب تک یہ سب دیکھتا رہوں ۔ آخر کب تک ۔

سعیدہ بیگم : افسر ! (رو دیتی ہیں)

افسر : آپ یوں ہی آنسوؤں سے اپنی پیاس بجھاتی رہیے ۔ لیکن ان چھینٹوں سے وہ آگ ٹھنڈی نہ ہو سکے گی جو میرے سینے میں جل رہی ہے ممی !

رشید صاحب : (دور سے) مشتاق ! ابے او مشتاق !

سعیدہ بیگم : یا اللہ ! میں کیا کروں ۔ کوئی نہیں سمجھتا ۔ کوئی نہیں ۔ سب میری جان کے دشمن ہیں ۔ مشتاق او مشتاق !

مشتاق : جی بیگم صاحب ! (بھاگتا ہوا آتا ہے)

سعیدہ بیگم : جا ، لے جا کھانا ۔ تولیہ نکال لے الماری سے ، دھلا ہوا ۔ صابن دان غسل خانے میں ہے ۔ اور یہ لے سلاد کی پلیٹ لیتا جا ۔ جب تک میں نکالتی ہوں کھانا !

مشتاق : جی بیگم صاحب ! (باہر جاتا ہے)

[لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

مجید چچا : (دور سے ۔ گھبرائی ہوئی آواز میں) دولھن ۔ دولھن ۔

سعیدہ بیگم : (گھبرا کر) مجید بھائی پکار رہے ہیں ۔ بیٹے ! ذرا دیکھ تو لو — کیا بات ہے ۔

[دادی امّاں درد سے کراہ رہی ہیں۔ سانس تیز تیز چل رہی ہے۔]

دادی امّاں : مجید! بیٹے۔ (ہانپتے ہوئے) ذرا رشید کو بلا دو۔

افسر : (قریب آکر) دادی امّاں! دادی اماں!

[دادی امّاں کے کراہنے کی آواز اور تیز ہو جاتی ہے]

دادی امّاں : کون؟ افسر! بیٹے ذرا رشید کو بلا دو! رشید کو — رشید کو بلا دو۔

[پس منظر سے قہقہوں کا شور]

دادی اماں : بلا دو بیٹے اسے۔

افسر : آپ لیٹ جایئے دادی امّاں! لیٹ جایئے۔

مجید چچا : بیٹا ذرا دوڑ کر حکیم صاحب کو بلا لاؤ۔ مجھے امّاں کا حال اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

دادی امّاں : (کراہتے ہوئے) ٹھیک ہوں میں بیٹے! بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا رشید کو بلا دو۔

افسر : آپ لیٹ تو جایئے۔ میں ابھی بلا کر لاتا ہوں حکیم صاحب کو!

[باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھتا ہے]

رشید صاحب : (افسر کی چاپ سن کر) کون؟ افسر؟ کہاں جا رہے ہو؟

افسر : (خشک لہجے میں) حکیم صاحب کو بلانے۔

رشید صاحب : حکیم صاحب؟ کیوں؟

افسر : دادی امّاں کی حالت خراب ہے۔

رشید صاحب : وہ تو ڈاکٹر ماتھر کے زیرِ علاج تھیں نا؟

افسر : آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ڈاکٹر ماتھر کا علاج ہم جیسوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

رشید صاحب : (جلدی سے) علاج بدل دیا ان کا۔ امّاں تو کسی قیمت پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب ان کی دوا کارگر نہیں ہو رہی ہے تو کیوں نہ حکیم منظور صاحب کو آزما لیا جائے۔

افسر : ڈیڈی آپ کو بھی غلط فہمی ہوئی۔ ڈاکٹر ماتھر نے کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھا۔

رشید صاحب : (غصّے میں) افسر!

افسر : جی! میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کو شاید پتا نہیں۔ ڈاکٹر ماتھر کے ایک دن کے علاج پر کبھی کبھی چار پانچ سو اٹھ جاتے ہیں۔ اور اتنی رقم میں تو ممّی ڈیڑھ مہینے کا خرچ سنبھال لیتی ہیں۔

رشید صاحب : افسر! بکواس بند کرو!

افسر : (پرسکون لہجے میں) میں جاتا ہوں، جارہا ہوں۔ آپ نے روکا نہ ہوتا تو میں اب تک حکیم صاحب کے گھر پہنچ گیا ہوتا۔ صبح ایک روپے کا نسخہ انھوں نے بندھوا کر بھیجا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ دن میں دادی امّاں کو صرف سیب دیے جائیں اور سنترے کا عرق۔ لیکن ڈیڈی۔ کل ممّی نے جو ردّی بیچی تھی اس سے کُل چار روپے ہاتھ لگے تھے۔

رشید صاحب : (غصّے سے کانپتی ہوئی آواز) افسر!

افسر : (پرسکون لہجے میں) ان چار روپوں میں سے دو مشتاق نے لے لیے تھے۔ اسے دو مہینے سے تنخواہ نہیں ملی۔ خمیرہ مروارید بھی منگوانا تھا لیکن ممّی کی ہمّت نہ ہوئی جبار صاحب کی دکان سے ادھار منگوانے کی۔ ان کا شاید تین مہینوں سے حساب نہیں ہوا۔

رشید صاحب : (ہسٹیریائی انداز میں) دماغ الٹ گیا ہے تمھارا۔ کیا بک رہے ہو؟ کس کے گھر کا قصّہ لے بیٹھے۔

افسر : (تلخ لیکن پرسکون لہجے میں) اس گھر کا جس کے سربراہ آپ ہیں۔ اور پتا ہے آپ کو! اس وقت کی دعوت کا اہتمام کرنے کے لیے مجید چچا کو اپنی گھڑی بیچنی پڑی۔ یوں بھی انھیں وقت کا حساب رکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

[لرزہ خیز موسیقی]

رشید صاحب : تم، کمینے، بدتمیز، گنوار۔ میری ہنسی اُڑاتے ہو! نکل جاؤ یہاں سے، دفعان ہوجاؤ۔ چلے جاؤ۔

افسر : (پرسکون لہجہ) میری کیا مجال ڈیڈی جو آپ کی ہنسی اُڑاؤں۔ ہم سب ہنسنا بھول چکے ہیں۔ اس گھر میں ہنسی کے جملہ حقوق آپ کے نام وقف کر دیے گئے ہیں۔

رشید صاحب : (انتہائی غصّے میں) کمینے، ذلیل۔ ناخلف! تمھاری یہ مجال۔ زبان درازی کرتے ہو۔ شرم نہیں آتی مہمانوں کے سامنے — چلے جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔

[دور سے ایک لمبی چیخ]

[لرزہ خیز موسیقی۔ افسر بھاگتا ہوا اندر جاتا ہے]

دادی اماں : (ہچکیاں لیتے ہوئے) آآآہ — آہ —

افسر : دادی اماں! دادی اماں! [سعیدہ بیگم بھاگی ہوئی آتی ہیں]

سعیدہ بیگم : اماں —

دادی اماں : (ڈوبتی ہوئی آواز میں) او رشید — رشید —

مجید چچا : افسر۔ جلدی کر بیٹے! حکیم صاحب کو بلا لاؤ۔

[موسیقی کی گت تیز ہو جاتی ہے]

دادی اماں : او رشید — مجید — بیٹے — افسر — دولھن — تم سب آؤ! میرے پ پاس — آؤ — نگہت — اخ اختر — دولھن — د دولھن —

[موسیقی کی لہر ایک جھنکار پر ختم ہو جاتی ہے]

سعیدہ بیگم : (چیخ کر) اماں! اماں! آنکھیں کھولو اماں!

[مجید چچا اونچی آواز سے رونے لگتے ہیں]

رشید صاحب : (اندر آتے ہوئے) ارے — (گھبرا کر) یہ کیا ہوا؟ کیا ہوا اماں کو۔

افسر : (بھرائی ہوئی آواز میں) باہر جائیے ڈیڈی۔ باہر جائیے۔ مشتاق نے کھانا لگا دیا ہے۔

[اختتامیہ موسیقی]

زندگی کی طرف

آوازیں

خورشید : ایک خواب پرست نوجوان۔ نکما اور جذباتی۔
ناصر : خورشید کا قریبی دوست۔ ہنسوڑ اور زندہ دل۔
نوید : خورشید کا چھوٹا بھائی، انتہائی مستعد اور عملی نوجوان۔ خاندان کی مشترکہ تجارت کا نگراں۔ خورشید کا شریکِ کار۔
فوزیہ : خورشید کی چھوٹی بہن۔ کالج کی طالبہ۔
امّی : خورشید، نوید اور فوزیہ کی امّی۔
منشی جی : خورشید اور نوید کے کارخانے کے پرانے ملازم۔ خوشامدی اور چرب زبان۔
اکاؤنٹنٹ : کارخانے کا محاسب۔ چالاک اور جوڑ توڑ والا ادھیڑ عمر کا آدمی۔
بوائے : ہوٹل کا ملازم۔
ہمایوں : فوزیہ کا منگیتر۔
ایک اجنبی۔
بجّو بابا : چوکیدار (خورشید کے خاندان کا بوڑھا، خانہ زاد ملازم)

[ابتدائی موسیقی ـــــ فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی خورشید میز پر زور سے کتاب رکھتا ہے۔ ایک طویل جمائی لیتا ہے اور سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس جلاتا ہے ـــ]

خورشید :۔ (چند ثانیوں کے وقفے کے بعد ـــــ دھیمے سروں میں)
شام آئی، صحنِ جاں میں خوف کا بستر لگا
شام آئی، " " " "
مجھ کو اپنی روح کی ویرانیوں سے ڈر لگا
مجھ کو اپنی " " " "
شام آئی " " " "

[دروازے پر دستک، خورشید چونک کر رک جاتا ہے پھر اٹھ کر دروازہ کھولتا ہے۔]

ناصر :۔ (اندر آتے ہوئے خورشید کی پیٹھ پر ایک دھول جماتا ہے) اُلّو کی دُم، ڈرپوک کہیں کے ـــــ (منہ بنا کر) "مجھ کو اپنی روح کی ویرانیوں سے ڈر لگا۔" ہونہہ۔ اب کوئی پوچھے کہ صاحب، یہ روحِ مبارک اتنی ویران کیوں واقع ہوئی ہے کہ آپ ڈرے جا رہے ہیں۔ بتائیے ـــــ

خورشید :۔ (مضمحل انداز میں) بکواس شروع کردی تم نے ناصر!

ناصر :۔ ہر دم خواب دیکھتے رہے تو آنکھیں تھک جائیں گی خورشید ــــ ذرا باہر نکلو۔ چلو، ایک چکر سول لائنس کا لگا آئیں۔

خورشید :۔ سول لائنس ؛ سول لائنس میں کیا رکھا ہے؟

ناصر :۔ (جھنجھلا کر) میں تمہاری طرح اُلّو تو ہوں نہیں کہ اس کال کوٹھری میں پڑا فلسفیانہ ذکر و فکر کرتا رہوں۔ دنیا اس کمرے سے باہر بھی ہے۔

خورشید :۔ (دھیمے لہجے میں) باہر کی دنیا کا تماشہ اس وقت دیکھنا چاہیے جب آنکھیں اپنی دید سے اکتا چکی ہوں۔ میں تو ابھی اپنی ہی ذات کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

ناصر :۔ (قہقہہ لگا کر) یار خورشید! اس قسم کے ڈائیلاگ تو بولا نہ کرو۔ خدا کی قسم ہنسی ضبط نہیں ہوتی۔ اے آدمی ہو کر چراگاہ۔ چلو، اٹھو، باہر نکلو ــــ

خورشید :۔ (اٹھتے ہوئے) چلتے ہیں، لیکن یہ سول لائنس ہی کی قید کیوں ہے؟

ناصر :۔ پھر کیا قبرستان کی سیر کی جائے۔

خورشید :۔ (کھوئے ہوئے لہجے میں) قبرستان! ایک وہی تو شہر ہے جو کبھی نہ اجڑے گا۔ وہاں مجھے کبھی ویرانی کا احساس نہیں ہوتا۔

ناصر :۔ (طنزیہ) جی ہاں! جی ہاں! ویرانی کا احساس تو سول لائنس میں ہوتا ہے ــــ نیون لائٹس، جگ مگ جگ مگ کرتے منظر، خوبصورت زرق برق چہرے ــــ توبہ توبہ، کیسی ویرانی ہوتی ہے ــــ (قہقہہ لگا کر) اور قبرستان؟ جی ہاں! قبرستان میں کیا چہل پہل رہتی ہے۔ ہر قبر میں ایک انجر پنجر ــــ اور ایک ہی کیوں۔ خدا جانے کتنے ایک کے اوپر ایک دفن کر دیے گئے ہوں گے۔ مُردوں کا کال تو ہے نہیں ــــ پھر جھینگروں کا نغمۂ سرمدی اور کسی درخت کی لنڈ منڈ شاخ سے لٹکا ہوا چمگادڑ۔ پھر اس بستی میں رہ رہ کر گونجتی ہوئی اُلّو کی مفکرانہ صدا ــــ سبحان اللہ کیا چہل پہل رہتی ہے؟ (ہنستا ہے)

(خورشید اضطراب آمیز انداز میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور سگریٹ

سلگاتا ہے]

خورشید :۔ (افسردہ لہجے ہیں) تم نہیں سمجھ سکتے۔ نہیں سمجھ سکتے ناصر! کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔ نہ امی نہ فوزیہ نہ نوید۔ کوئی نہیں سمجھتا۔

ناصر :۔ (بیٹھتے ہوئے) کیا نہیں سمجھتے؟

خورشید :۔ یہی کہ چیزیں جیسی دکھائی دیتی ہیں ویسی ہوتیں بھی تو دنیا کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ تم سب کیا جانو کہ شہر کتنے ویران ہیں؟ چہرے کتنے ویران ہیں؟ آنکھیں کتنی ویران ہیں؟ کھنڈر نہ ہوں تو اس شہر میں جینا دشوار ہو جائے۔

[ناصر قہقہہ لگاتا ہے]

خورشید :۔ (افسردگی سے) تم نہیں جانتے کہ قہقہے کتنے ویران ہوتے ہیں۔ روشنی کتنی سیاہ ہوتی ہے۔ بستیاں کتنی اجاڑ ہیں — !

ناصر :۔ (اچانک اٹھ کر) اچھا اب بکواس بند کرو۔ باہر چلو!

خورشید :۔ باہر، باہر کیا رکھا ہے؟ اور اندر کیا کچھ نہیں ہے؟

ناصر :۔ (زور سے) اندر صرف ویرانی ہے۔ تم — تم — نکمے اور منحوس آدمی — تم اپنے وجود کی کال کوٹھری میں بیٹھے سوائے اندھیروں کے اور کیا دیکھ سکتے ہو۔ — باہر چلو —

خورشید :۔ کچھ دیر اور ٹھہرو — پھر چلتے ہیں۔

ناصر :۔ لیکن اب میں تمھاری بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں!

خورشید :۔ (بہت افسردہ لہجے میں) تو کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو ناصر کہ میں بکواس کرتا ہوں؟

ناصر :۔ (یقین کے ساتھ) ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں!

خورشید :۔ اور فوزیہ؟

ناصر :۔ فوزیہ بھی ٹھیک سمجھتی ہے

خورشید :۔ اور امی؟

ناصر :۔ امی بھی یہی سمجھتی ہیں۔

خورشید :۔ اور نوید ـــ؟
ناصر :۔ نوید بھی ـــ
[اچانک بیچ ہی میں چیخ پڑتا ہے]
خورشید :۔ (بہت جذباتی ہوکر) بس کرو! بس کرو! تم سب میرے دشمن ہو ـــ تم سب ـــ (کھانسنے لگتا ہے)
[اضطراب آمیز موسیقی کی ایک لہر]
۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈ ان ـــ
[مشینوں کا شور ـــ پس منظر میں ملی جلی آوازیں ـــ فون کی گھنٹی بجتی ہے]
نوید :۔ (فون اٹھاکر) یس! نوید اسپیکنگ ـــ جی ہاں! جی ہاں! مسٹر خورشید! ہاں! وہ میرے بڑے بھائی ہیں ـــ بزنس پارٹنر بھی! ـــ پھر ـــ لیکن یہ کیا؟ مجھے EXPLAIN تو کرنے دیجیے ـــ مم میں ـــ (دوسری طرف سے فون ڈس کنکٹ کردیا جاتا ہے)
[نوید غصے میں ریسیور کریڈل پر پٹکتا ہے ۔ اضطراب آمیز انداز میں گھنٹی بجاتا ہے ۔ قریب آتے ہوئے پیروں کی چاپ ـــ منشی جی اندر آتے ہیں ـــ
نوید :۔ (تحکم آمیز انداز میں) منشی جی!
منشی جی :۔ (ہکلاکر) ح حضور!
نوید :۔ بیٹھ جائیے ـــ
منشی جی :۔ ح حضور! (بیٹھ جاتے ہیں)
نوید :۔ کل سہ پہر کو کوئی بزنس پارٹی آئی تھی؟
منشی جی :۔ ح حضور!

نوید :۔ اُس نے کچھ آرڈر دینے چاہے تھے ؟

منشی جی :۔ ح حضور !

نوید :۔ (جھنجھلا کر) یہ حضور حضور کی رٹ کیا لگا رکھی ہے ؟ آپ درباریوں کے طور طریقے بدل نہیں سکتے ؟

منشی جی :۔ ح حضور !

نوید :۔ (دانت پیس کر) میں کہتا ہوں یہ حضور حضور بند کیجیے اور مجھے صاف صاف بتایئے ــــ

منشی جی :۔ (سہم کر) ح ح حضور !

نوید :۔ (سر پکڑ کر) میرے خدا ! بھائی صاحب نے تباہ کر دیا ہے آپ سب کو ــ اس طرح تو کام چلنے سے رہا۔ اکاؤنٹنٹ کو بلایئے ــــ

[منشی جی باہر جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد منشی جی اور اکاؤنٹنٹ ساتھ ساتھ اندر آتے ہیں]

نوید :۔ (بھاری آواز میں) بیٹھ جایئے ــــ

[دونوں کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں]

نوید :۔ اکاؤنٹنٹ صاحب ! آپ نے پچھلے چھ مہینوں کا حساب تیار کر لیا ہے ؟

اکاؤنٹنٹ :۔ جی !

نوید :۔ قرض کی قسطیں ادا ہو گئی ہیں ــــ ؟

اکاؤنٹنٹ :۔ قسطیں ؟ ــــ ان کی ادائیگی کے لیے بینک سے مزید قرض لینا پڑے گا۔

نوید :۔ مزید قرض ــــ ؟

اکاؤنٹنٹ :۔ جی ہاں ! پچھلے تین مہینوں کی قسطیں ابھی بھیجی جانی ہیں۔

نوید :۔ (جھنجھلا کر) لیکن آپ نے یہ بات مجھ سے پہلے کیوں نہیں بتائی ؟

اکاؤنٹنٹ :۔ بڑے صاحب کو بتا دیا تھا۔

نوید :۔ اور وہ سارے نوٹس ان کی میز پر پڑے ہوں گے ــــ (دانت پیس کر) لیکن

آپ کو مجھ سے تو کہنا چاہیے تھا۔

اکاؤنٹنٹ :۔ بڑے صاحب نے کہا تھا کہ وہ آپ سے بات کریں گے ـــ

نوید :۔ (غصے میں) خورشید بھائی کو مجھ سے بات کرنے کی فرصت کب ہے؟ کہاں ہیں وہ؟

[منشی جی "حضور" کہتے ہوئے اٹھ کر باہر جاتے ہیں۔ چند لمحوں بعد واپس آتے ہیں]

منشی جی :۔ (پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے) حضور یہ نوش فرمائیں ـــ

نوید :۔ (چیخ کر) یہ پانی کس گدھے نے منگوایا تھا آپ سے؟ آپ تو خورشید بھائی کو دیکھنے گئے تھے۔

منشی جی :۔ (سہم کر) حضور اپنے ہونٹوں سے یہ گلاس لگالیں تو عرض کروں ـــ

نوید :۔ کیا عرض کریں گے؟

منشی جی :۔ یہی کہ بڑے صاحب ابھی تشریف نہیں لائے ـــ نصیب دشمناں کہیں طبیعت تو نہیں بگڑ گئی۔

[نوید غصے میں گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر زمین پر پھینک دیتا ہے۔ گلاس ٹوٹ جاتا ہے]

نوید :۔ (غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں) منشی جی آپ نے اس کاروبار کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ یہ درباداری ـــ لفاظی۔ بے وقت کی راگنی، اس کا مطلب کیا ہے؟ آپ بھلے آدمیوں کی طرح باتیں نہیں کر سکتے؟

منشی جی :۔ حضور ـــ پشتیں گزر گئیں اس ڈیوڑھی کی خدمت میں۔ پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کے ابا حضور مرحوم، خدا ان کے درجات بلند فرمائے ـــ بڑے قدر داں تھے اس غلام کے۔ فرماتے تھے ـــ

نوید :۔ (بیچ ہی میں) چپ ہوجایئے اور دفعان ہوئیے یہاں سے۔ جایئے ـــ چلے جایئے، جب ضرورت ہوگی میں آپ کو بلا لوں گا۔

[منشی جی "ح حضور" کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں]

نوید :۔ اکاؤنٹنٹ صاحب!

اکاؤنٹنٹ :۔ جی!

نوید :۔ گوشوارے لے آیئے ۔۔

[اکاؤنٹنٹ اٹھ کر باہر جاتا ہے۔ چند لمحوں بعد واپس آتا ہے ۔ اس اثنا میں صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے ۔]

اکاؤنٹنٹ اندر آتا ہے ۔۔

نوید :۔ بیٹھ جایئے ۔۔ (اکاؤنٹنٹ بیٹھ جاتا ہے)

اکاؤنٹنٹ :۔ یہ رہا گوشوارہ ۔۔ (کاغذات بڑھاتا ہے) تین مہینے سے قسطیں نہیں بھیجی جا سکی ہیں۔

نوید :۔ کیوں؟

اکاؤنٹنٹ :۔ ملازموں کی تنخواہ نکالنا بھی مشکل تھا۔ کارخانہ بند ہو جاتا۔ روزمرہ خرچوں کے لیے کچھ رقم محفوظ رکھنی ہی تھی۔

نوید :۔ لیکن قسطوں کا کیا ہوگا؟

اکاؤنٹنٹ :۔ اس کے لیے بینک سے قرض لے لیا جائے۔

نوید :۔ مزید قرض؟

اکاؤنٹنٹ :۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ۔

نوید :۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) میرے خدا! ۔۔ اس طرح کام کیسے چلے گا؟ کل شام کو آپ تھے جب ایک نئی بزنس پارٹی آرڈرس لے کر آئی تھی ۔

اکاؤنٹنٹ :۔ میں تھا!

نوید :۔ انھوں نے اپنا آرڈر کینسل کر دیا ہے۔

اکاؤنٹنٹ :۔ مجھے اس بات کا ڈر پہلے ہی تھا ۔

نوید :۔ کیوں؟

اکاؤنٹنٹ :۔ بڑے صاحب نے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ دوسرے کارخانہ داروں نے اپنے ریٹ گھٹا دیے ہیں۔ اُن کا مال بھی ہم سے گھٹیا ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال ــــ بڑے صاحب کو اُنھیں سمجھانا چاہیے تھا۔ بڑے صاحب ــــ

نوید :۔ (جھنجھلا کر) بڑے صاحب، بڑے صاحب، بڑے صاحب۔ اب بس کیجیے اور جائیے ــــ گوشوارے چھوڑ جائیے۔

[اکاؤنٹنٹ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ نوید بیقراری کے عالم میں کمرے ہی میں ٹہلنے لگتا ہے۔ پس منظر سے مشینوں کا شور۔]

۔ فیڈ آوٹ ۔

فیڈ ان ــــ

[ریستوران۔ موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنیں ــــ ملی جلی دھیمی آوازوں کا شور ناصر اور خورشید ایک میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ خورشید سگریٹ جلاتا ہے]

ناصر :۔ یہ تم اتنی دیر سے سوچ کیا رہے ہو خورشید؟

خورشید :۔ (چونک کر) ایں؟ مجھ سے کچھ کہا؟

ناصر :۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ اتنی دیر سے گُم سُم بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟

خورشید :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) آں ــــ اس وقت تو بس یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا سوچ رہا ہوں! (ایک جمائی لے کر) یار ناصر! یہ شام اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے؟

ناصر :۔ شام؟

خورشید :۔ ہاں شام! سورج کے ساتھ ہی میرا دل بھی ڈوبنے لگتا ہے۔

ناصر : کوئی عشق وشق کا چکر تو نہیں؟

خورشید :۔ دنیا کے کاروبار نے محبت کرنے کی نیکی بھی ہم سے چھین لی ناصر! محبت حساب کتاب سے الگ ہو کر کی جاتی ہے۔ اور اب کون سا تعلق ہے جو اتنا بے لوث ہو؟

ناصر :۔ (بزرگانہ انداز میں) میاں یہ محبت وحبت بھی نکموں کا کھیل تھی۔ اب فرصت کسے ہے؟

خورشید :۔ فرصت کسے کہ تیری تمنا کرے کوئی! غالبؔ اب سے سو سال پہلے ہی دنیا کے طور سمجھ گئے تھے۔

ناصر :۔ سمجھے کیا خاک، عمر بھر اپنی حالت کا رونا روتے رہے۔

خورشید :۔ اچھا ہوا جو نہیں سمجھے ورنہ ہم دیوانِ غالب سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

ناصر :۔ (چونک کر) فی الحال تو ہم چائے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ایک دم ٹھنڈی ہو گئی۔ دوسرا پاٹ (POT) منگواؤں؟

خورشید :۔ (دھیرے سے) ہاں!

ناصر :۔ (پکارتا ہے) بوائے، او بوائے —— (چمچے سے پیالی کھنکاتا ہے)

بوائے :۔ (دور سے) آیا صاحب! (بوائے آتا ہے)

ناصر :۔ دیکھو! یہ چائے برف ہو چکی ہے۔ دوسرا پاٹ لاؤ ——

بوائے :۔ جی صاحب! (برتن سمیٹ کر واپس جاتا ہے)

خورشید :۔ تم ہمایوں سے ملے تھے؟

ناصر :۔ ملا تھا!

خورشید :۔ کوئی بات ہوئی؟

ناصر :۔ ہاں! لیکن اس وقت چھوڑو!

خورشید :۔ کیوں؟

ناصر :۔ میں تمھیں اور اداس کرنا نہیں چاہتا۔

خورشید :۔ میں اداسی سے ڈرتا نہیں ناصر! ایک وہی تو اپنی رفیق ہے۔

[بوائے چائے کی ٹرے لے کر آتا ہے اور برتن میز پر جماتا ہے]

بوائے :۔ کچھ اور صاحب!

خورشید :۔ نن —— نہیں۔ (بوائے چلا جاتا ہے)

خورشید :۔ ہاں تو تم نے بتایا نہیں؟

ناصر :۔ کیا کرو گے سن کر، تمھیں دکھ پہنچے گا۔

خورشید :۔ کیوں ؟

ناصر :۔ ہمایوں کے گھر والے بھی پرلے درجے کے بنیئے ثابت ہوئے۔ وہ شادی سے پہلے سارا حساب کتاب طے کرلینا چاہتے ہیں۔

خورشید :۔ حساب کتاب؟

ناصر :۔ ہاں! ان کے مطالبات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

خورشید :۔ لیکن شادی تو دو افراد کا معاملہ ہے۔

ناصر :۔ تم اب تک پتا نہیں کس دنیا میں رہتے ہو ـــ تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ اب رشتوں کے بھی دام لگتے ہیں۔ (اچانک غصے میں آجاتا ہے) خورشید! تم اتنے معصوم بھی نہیں کہ اتنی ذرا سی بات نہ سمجھو۔ لیکن تم جان بوجھ کر سب کچھ تباہ کر رہے ہو۔

خورشید :۔ میں تباہ کر رہا ہوں ـــ؟

ناصر :۔ (اسی لہجے میں) ہاں تم اور صرف تم! تم سب کچھ جانتے ہو پھر بھی تمھیں ہوش نہیں آتا۔ فوزیہ کے جذبات تمھیں معلوم ہیں۔ ہمایوں کو بھی تم سمجھتے ہو۔ لیکن اس کے گھر والے!

خورشید :۔ تو کیا اب افراد اتنے آزاد بھی نہیں ہوتے؟

ناصر :۔ (دانت پیس کر) فرد! فرد! فرد! فرد کیا ہوتا ہے؟ ایک دم گدھا۔ سماجی مشین کے ایک بے نام، بے چہرہ پرزے کو تم خدا جانے کیا سمجھتے ہو؟ ہر فرد اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ دوسروں کے لیے اس کی حیثیت کیا ہے! اُس معاشرے کو، جس میں وہ جی رہا ہے، کس حد تک نفع یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت اس میں موجود ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ بھی نہیں تو پھر جینا محال ہے۔

خورشید :۔ (دکھے ہوئے لہجے میں) شاید اسی لیے تو ناصر، کچھ لوگ سانس لیتے ہیں لیکن زندہ دکھائی نہیں دیتے۔ اُف! تاریخ کی کتابیں نہ ہوں تو زندہ لوگوں سے شاید تعارف بھی نہ ہو سکے۔ مجھے وہ شہر بہت اجاڑ دکھائی دیتے ناصر، جہاں کھنڈر نہ

ہوں ۔۔۔

ناصر :۔ کھنڈر!

خورشید :۔ ہاں کم از کم وہاں یادوں کی انجمن تو آباد دکھائی دیتی ہے۔

ناصر :۔ (غصے میں) تم اپنے آپ کو بھی تباہ کر رہے ہو اور انھیں بھی جنھوں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا۔

خورشید :۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) ناصر!

ناصر :۔ تم اپنے ہی دشمن نہیں اُن کے دشمن بھی ہو جن کے دلوں میں تمھارے لیے صرف محبت ہے۔

خورشید :۔ (جذباتی ہو کر) ناصر!

ناصر :۔ تم سب کچھ اجاڑ دو گے! سب کچھ اور جب تمھاری آنکھیں کھلیں گی اُس وقت بہت دیر ہو چکی ہو گی۔

خورشید :۔ (چیخ کر) ناصر ۔۔۔

[پس منظر سے لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

ناصر :۔ چیخو مت! یہ تمھارا کمرہ نہیں ریسٹوراں ہے۔ چائے پیو اور چلو! پھر چل کر خوب چیخ لینا۔

خورشید :۔ (ہانپتے ہوئے) چائے؟

ناصر :۔ ہاں چائے پی لو ۔۔۔ لیکن یہ پاٹ بھی ٹھنڈا ہو چکا۔

خورشید :۔ (بڑبڑاتے ہوئے) یہ پاٹ بھی ٹھنڈا ہو چکا۔ اٹھو! میں چائے نہیں پیوں گا۔ سینے میں یوں ہی آگ دہک رہی ہے ۔۔۔ اٹھو! اٹھو ناصر!

[پس منظر سے لرزہ خیز موسیقی ۔۔۔]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈان :

[گھڑیال میں دن کے تین بجتے ہیں۔ باہر لُو کا شور۔ گرتے ہوئے پتوں

کی کھڑکھڑاہٹ۔ بچّو بابا چھڑی ٹیکتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے اندر آتے ہیں ___]

امّی :۔ (کمرے کے اندر سے) کون!

بچو بابا :۔ (تھکی ہوئی آواز میں) یہ ہم ہیں۔ (کھانسنے لگتے ہیں)

امّی :۔ بچّو بابا! کیا بات ہے؟ (کمزور آواز میں) تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

بچو بابا :۔ ہاں بہو! ہم ٹھیک ہیں۔ بٹیا کیسی ہیں؟ (کھانستے ہیں)

امّی :۔ اندر آجاؤ ___ (بچّو بابا اندر آتے ہیں)

امّی :۔ فوزیہ ___ ٹھیک ہے اب۔ ٹھیک ہے بچو بابا۔ ابھی نوید نہیں آیا۔

بچو بابا :۔ نوید بھیّا ابھی نہیں آئے بہو، کارکھانے میں ہوں گے۔ کہو تو جاکے ہم بُلا لائیں۔

امّی :۔ اور خورشید؟

بچو بابا :۔ بڑے بھیّا کا تو صبح سے کچھ حال نہیں ملا۔ کہیں منڈرائے رہے ہوئیں گے۔

امّی :۔ کیا آج بھی وہ کارخانے نہیں گیا۔

بچو بابا :۔ ناہیں! کل نوید بھیّا سے کچھ گرما گرمی ہوگئی رہی۔ بہو! تم سمجھاؤ ذرا دونوں کو۔ بڑے کا مان بڑا۔ نوید بھیّا چھوٹے ہیں۔ وہی چھوٹے بن جائیں۔ اِسی کہا سُنی سے کچھ نہ ہوئے گا۔ ہمری مانو تو کچھ روز کے لیے نوید بھیّا کو گانو بھیج دیو۔ سر پر آئے گی تو بڑے بھیّا آپ ہی ہوس میں آئے جائیں گے۔

امّی :۔ (گھبرا کر) ایسا نہ کہو بچو بابا۔ اگر نوید کہیں خفا ہو کر چلا گیا تو ___

بچو بابا :۔ (کھانستے ہوئے) اُن کی مجال جو تم ہوں سے کھپھا ہوئی جائیں۔ تم نہ کہہ سکو تو پھر بہو ہم کہے دیت ہیں۔ ہمری بات وہ نہ ٹالیں گے۔

امّی :۔ نہیں بچو بابا! نہیں! ایسا مت کہو۔ میں خورشید کو سمجھاؤں گے۔ میں سمجھاؤں گی اُسے۔ اور اگر اب بھی وہ نہ سمجھا تو میں خود چلی جاؤں گی گاؤں۔ فوزیہ کو لے کر۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے۔ لے دے کر یہ حویلی بچی تھی۔ وہ بھی رہن رکھ دی

گئی۔ پرانے نوکر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ قبروں کے کتبے بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ ان کی مرمت کا دھیان بھی نہیں آتا بدنصیبوں کو۔

بجو بابا :۔ ایسا نہ کہو بہو (کھانسی کا دورہ پڑتا ہے) ایسا نہ کہو (گلوگیر لہجے میں) ابھی پرکھن کا نام لوگ بھولے تھوڑے ہیں۔ اپنے جی کو ڈھارس دیو بہو! اس ڈیوڑھی کا مان ابھی باقی ہے۔

(قریب آتی ہوئی پیروں کی چاپ)

نوید اندر آتا ہے ــــ

نوید :۔ (بجھے ہوئے طنزیہ لہجے میں) تم سب یادوں کے سہارے زندہ ہو بجو بابا۔

امی :۔ (کانپتی ہوئی کمزور آواز میں) نوید!

نوید :۔ (اُسی رَو میں) تم سب کھوئے ہوئے دنوں کی پرچھائیں سے لپٹے ہوئے ہو۔

امی :۔ نوید ــــ!

نوید :۔ تم سب بجھتے ہوئے رنگوں پر نظر گاڑے ہوئے ہو۔

امی :۔ (جذباتی، کمزور، کانپتی ہوئی آواز) نوید!

نوید :۔ تم سب راکھ میں چنگاریاں ڈھونڈ رہے ہو۔

امی :۔ (چیخ کر) نوید!

نوید :۔ اب رہ کیا گیا ہے امی! میں کب تک تمھیں جھوٹی تسلیاں دیتا رہوں۔ کب تک بہلاوے میں رہو گی۔ کاروبار چوپٹ ہو چکا۔ آج کارخانہ بند کرنا پڑا۔ اب اتنا بھی نہیں رہ گیا تھا کہ ہم مزدوروں کو تنخواہ دے سکیں۔ کاری گروں نے کام پر آنا بند کر دیا۔ حویلی رہن رکھی جا چکی ہے۔ رہ کیا گیا ہے اب؟

امی :۔ قبروں کے کتبے ــــ

نوید :۔ (اچانک غصے میں) امی تم کب تک کتبوں کی حفاظت کرتی رہو گی۔ آدمی ٹوٹ جاتے ہیں پھر قبروں کا کیا رونا!

امی :۔ (جذباتی لہجے میں) نوید ــــ (رونے لگتی ہیں)

نوید :۔ (گلا گیر لہجے میں) چپ ہو جاؤ امّی چپ ہو جاؤ۔ کہیں فوزیہ کی آنکھ کھل گئی تو۔
امّی :۔ (روتے ہوئے ــــ بہت مشکل سے ضبط کرتی ہیں) فوزیہ ــــ ابھی سو رہی ہے۔
نوید :۔ (ہارے ہوئے لہجے میں) سونے دو اُسے امّی! وہ خواب دیکھ رہی ہوگی۔ اُسے سونے دو۔ جاگنے کے لیے ہم سب بہت ہیں۔
بجّو بابا :۔ (کھانسی کا دورہ پڑتا ہے) سب بیٹا! اس ڈیوڑھی کا مان!
نوید :۔ (جلدی سے) بجّو بابا!
بجّو بابا :۔ اس ڈیوڑھی پر دو دو ہاتھی جھولتے رہے بیٹا! اب کل کی ہی تو بات ہے۔
نوید :۔ (زچ ہو کر) افوّہ بجّو بابا! تم تو جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگتے ہو۔
امّی :۔ (مضمحل لہجے میں) خورشید کہاں ہے؟
نوید :۔ (دل شکستہ لہجے میں) میں اُن سے کچھ نہ کہوں گا امی! کچھ بھی نہیں۔ کل میں نے اُن سے گستاخی کی تھی۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ ہم سب اب گاؤں چلتے ہیں۔
امّی :۔ گاؤں؟
نوید :۔ ہاں گاؤں! مٹّی اتنی بے مروّت نہیں ہوتی امی! ہمارے کھیت، باغ، بانسوں کا جنگل ــــ ہمارے مویشی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔
امّی :۔ اور قبروں کے کتبے ــــ
نوید :۔ (محبت آمیز لیکن افسردہ لہجے میں) تم کتنی بھولی ہو امّی! ہم سنبھل گئے تو ہمارے پرکھوں کی قبریں بھی بن جائیں گی۔ تم ان کا اتنا دُکھ کیوں کرتی ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، امّی (جھوٹی ہنسی ہنس کر) سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔
امّی :۔ اور ہمایوں؟
نوید :۔ ہمایوں بھی۔ تم فکر نہ کرو امّی۔ فوزیہ کتنی معصوم ہے؟ اس سے کچھ نہ کہنا۔
امّی :۔ لیکن وہ اب ایسی بچّی بھی نہیں کہ کچھ نہ سمجھے۔ پھر اس کی پڑھائی؟
نوید :۔ پڑھائی؟ پڑھائی کا کیا ہے؟ اگر وہ چاہے تو اُسے ہوسٹل میں چھوڑا جا سکتا ہے!

امّی :۔ پھر تو وہ سب کچھ جان جائے گا ۔ سب کچھ۔ وہ بھی جو اُسے نہیں جاننا چاہیے۔
نوید :۔ میں اُسے سمجھا دوں گا امّی! ہم گاؤں چلتے ہیں۔ ہم سب۔
امّی :۔ (افسردہ لہجے میں) اور خورشید — (اچانک رو پڑتی ہیں)
(پس منظر سے حزینہ موسیقی کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی جاتی ہے)
۔فیڈ آوٹ۔

فیڈان:
[پارک کا ایک گوشہ۔ ایک طرف سے پرندوں کے چہچہے۔ فوزیہ کے قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ہوئی —]
ہمایوں :۔ (خوش ہوکر) فوزیہ!
فوزیہ :۔ ہمایوں —
ہمایوں :۔ بہت دیر لگا دی تم نے۔ میں کب سے آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں یہاں۔
فوزیہ :۔ (رک رک کر) ہم کیا کرتے ہمایوں۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔ صوفیہ، سیما اور نرگس بھی ساتھ تھیں۔ انھیں ٹالنا آسان نہیں تھا۔
ہمایوں :۔ کیا کہا تم نے ان سے؟
فوزیہ :۔ (شرماتی ہوئی ہنسی کے ساتھ) یہی کہ ہمایوں سے ملنے جا رہے ہیں!
ہمایوں :۔ (گھبرا کر) کیا واقعی؟
فوزیہ :۔ اللہ ہمایوں! تم بھی کتنے بزدل ہو۔ (ہنستی ہے)
ہمایوں :۔ میں بزدل نہیں ہوں فوزیہ۔ لل لیکن —
فوزیہ :۔ (جلدی سے) لیکن کیا؟ تمھاری جان سوکھی جا رہی ہے۔ اور ہمیں دیکھو۔ کتنے اطمینان سے تم سے ملنے چلے آئے۔ (ہنسی)
ہمایوں :۔ (سنجیدہ ہوکر) تم مجھ سے بدگمان نہ ہونا فوزیہ۔ تم ابا جی کا مزاج جانتی ہو۔
فوزیہ :۔ (ہنس کر) اور تمھارا بھی!
ہمایوں (افسردہ لہجے میں) تمھاری بدگمانی کس طرح دور کروں فوزیہ؟

فوزیہ :۔ (ہنس کر) ارے! تم تو واقعی سنجیدہ ہوتے جا رہے ہو۔ ہم نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا۔

[ایک لمحے کا وقفہ]

ہمایوں :۔ تم نے آج بلایا کیوں تھا فوزیہ؟

فوزیہ :۔ کیوں؟ کیا نہ بلاتے؟

ہمایوں :۔ پھر بھی! بتاؤ تو۔

فوزیہ :۔ (ہنس کر) بات یہ ہے کہ کل ہم گاؤں جا رہے ہیں!

ہمایوں :۔ (چونک کر) گاؤں! گاؤں کیوں؟

فوزیہ :۔ یوں ہی!

ہمایوں :۔ واپسی کب تک ہوگی؟

فوزیہ :۔ جانے کب؟ ہم کیا بتا سکتے ہیں؟

ہمایوں :۔ (گھبرا کر) کیوں؟ یہ بیٹھے بٹھائے گاؤں جانے کی کیا سوجھی؟

فوزیہ :۔ (ٹھہر ٹھہر کر، افسردہ لہجے میں) تمھیں تو گھر کے قصوں کا پتا ہے ہی۔ بھائی جان اپنی روش چھوڑ نہیں سکتے۔ نوید بھائی بھی کیا کریں۔ سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ اور تمھارے ابا جی ہیں کہ ـــــ (کہتے کہتے رک جاتی ہے)

ہمایوں :۔ (قدرے تیز لہجے میں) کچھ نہیں سمجھتے یہ لوگ فوزیہ۔ کچھ بھی تو نہیں سمجھتے ـــ ہمارے بزرگ ایک طرف تو روایتوں اور قدروں کی بات کرتے ہیں۔ دوسری طرف دنیا کے معاملات میں کتنی ہلکی باتیں کرتے ہیں۔

فوزیہ :۔ بڑوں کو الزام مت دو ہمایوں! اُنھیں بُرا نہ کہو!

ہمایوں :۔ (اسی لہجے میں) میں الزام نہیں دے رہا ہوں فوزیہ۔ سچی بات کہہ رہا ہوں۔ ابا جی کے پاس کیا نہیں ہے۔ کوٹھیاں، موٹریں، نوکر چاکر، گھر بھرا ہوا ہے۔ لیکن ـــ

فوزیہ : (افسردگی سے) ہمایوں!

ہمایوں : اور کیا انھیں معلوم نہیں کہ ان دنوں تمھارے گھر کی حالت کیا ہے؟

فوزیہ :۔ (غصّے میں) ہماری حالت جیسی بھی ہو۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم ہم پر ترس کھاؤ۔
ہمایوں :۔ (جذباتی ہوکر) مجھے معاف کردو فوزیہ، معاف کردو۔ ایک بیہودہ بات زبان سے نکل گئی۔
فوزیہ :۔ تمھیں تو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے ہمایوں۔
ہمایوں :۔ معاف کردو فوزیہ۔
فوزیہ :۔ (غصّے میں) اور اگر تمھارے گھر والے ایسے ہیں اور تم اُن کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتے تو ٹھیک ہے! آج کے بعد ہماری صورت نہ دیکھنا۔
ہمایوں :۔ (ملتجیانہ لہجے میں) فوزیہ ــــ!
فوزیہ :۔ تمھارے گھر والے جیسے بھی ہیں، یہ ان کی مجبوری ہے۔ لیکن کیا تم بھی اتنے مجبور ہو کر ــــ
ہمایوں :۔ (جلدی سے) فوزیہ ــــ
فوزیہ :۔ (کانپتی ہوئی آواز) ہمایوں تم ہیں ــــ (رو پڑتی ہے)
[پس منظر سے حزنیہ موسیقی کی ایک طویل لہر جو رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہے]
فیڈ ان :۔
[بجّو بابا لاٹھی ٹیکتے ہوئے برآمدے سے گزرتے ہیں۔ سناٹے میں فرش پر اُن کے قدموں اور لاٹھی کی ٹھک ٹھک کی مسلسل آوازیں لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جاتی ہیں۔ اسی اثنا میں کوئی ٹین کے پھاٹک کو زور زور سے دستک دیتا ہے]
بجّو بابا :۔ (دور سے) ای کون ہے؟
[دستک کی مسلسل آواز۔ بجّو بابا لاٹھی ٹیکتے ہوئے پھاٹک کی طرف جاتے ہیں اور کنڈی کھولتے ہیں۔ پھاٹک کھلتا ہے]
اجنبی :۔ اس حویلی میں کوئی ہے؟

بچو بابا :۔ (حیرانی سے) پہلے ای بتاؤ کہ تم کون ہو؟

اجنبی :۔ (ہکلاکر) مم! میں ایک اجنبی ہوں!

بچو بابا :۔ اجنبی — (حیرت سے) ای نام تو ہم پہلی دَپھا سُن رہے ہیں۔ تم کہاں سے آئے رہے ہو؟ کاکرنے کو آئے ہو؟

اجنبی :۔ یہ حویلی خان بہادر جاوید علی خاں مرحوم کی ہے؟

بچو بابا :۔ (جلدی سے) اونہہ بڑے سرکار! ہاں ہاں! او اب کہاں ہیں؟ پرسال بڑے سرکار۔ دل کا دورہ پڑتے سے کھتم ہوئے گئے رہیں۔

اجنبی :۔ (حیرت سے) اف! میرے خدا! (رک کر) ان کے گھر والے تو ہوں گے۔

بچو بابا :۔ گھرما اب کون ہے؟ بڑے بھیّا رہتے ہیں تو ان کا کچھ ٹھیک نہیں۔ کب آویں کب جاویں۔ چھوٹے بھیّا، بہو اور بٹیا گالوٗ چلے گئے۔ اب یہاں تھوڑے بیٹھے ہیں۔

اجنبی :۔ لیکن وہ لوگ چلے کیوں گئے؟

بچو بابا :۔ تم بحث کاہے کا کر رہے ہو؟ تم سے مطبل؟ اُن کی گھریلو بات ہے۔ اب یہ دیکھو! اس حویلی کے دروازے پر ہاتھی جھولتے رہیں۔ کا مان رہی کا سان! کتنے بے سہارا لوگ بڑے سرکار کے سہارے جندگی کاٹ دیتے رہیں۔ سکھ چین کے ساتھ۔ سارے سہر میں ان کی دھوم رہی۔ پر اب کا رہ گیا ہے؟ بڑے بھیّا کی تو مت ماری گئی ہے —

اجنبی :۔ بڑے بھیّا کون؟

بچو بابا :۔ ارے وہی کھرسید بھیّا اور کون!

اجنبی :۔ (اچانک خوش ہو کر) خورشید؟ خورشید؟ میں اُسی سے تو ملنے آیا ہوں۔

بچو بابا :۔ (کچھ سوچ کر) تمھارا جی چاہے تو انتجار کر لیو۔ جی چاہے گھوم پھر آؤ۔

اجنبی :۔ نہیں؛ میں یہیں اُس کا انتظار کروں گا۔

بچو بابا :۔ تو آؤ ہمرے ساتھ — چلے آؤ۔ تمھارا نام کا ہے بھیّا۔ جرا ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔

اجنبی :۔ سیّد ــــ سیّد علی !
بچو بابا :۔ (دھیرے سے) سیّد علی !

[بچو بابا کی لاٹھی کی کھٹ کھٹ دور تک سنائی دیتی ہے۔ دور کوئی دروازہ کھلتا ہے، بند ہوتا ہے ــــ بچو بابا پھر لاٹھی ٹیکتے ہوئے اپنی کوٹھری کی طرف جاتے ہیں ۔]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈ ان :۔

سناٹا۔

[خورشید ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتا ہے۔ دھیرے دھیرے کمرے میں ٹہلنا شروع کرتا ہے]

خورشید :۔ (بہت دھیمے سروں میں)

کس کو پتا چلے گا کہ اک دن گزر گیا
کس کو پتا چلے گا کہ اک دن گزر گیا
دستک سرائے دل پہ اگر شام بھی نہ دے
دستک سرائے دل پہ اگر شام بھی نہ دے
میں بے لباط ہوں تو مجھے نام بھی نہ دے
دستک سرائے دل پہ اگر شام بھی نہ دے

[دروازے پر زوروں کی دستک]

خورشید :۔ (رک کر) کون ؟
ناصر :۔ (باہر سے) دروازہ کھولو کمبخت ــــ میں ہوں ۔

[خورشید دروازہ کھولتا ہے]

ناصر :۔ (اندر آتے ہوئے) شام شام شام ! یہ شام تمھارا آسیب کیوں بن گئی ہے ؟

(کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ہے) چلو! باہر نکلو! تمھیں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔

خورشید :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) ہوتا ہے :

ناصر :۔ پھر باہر کیوں نہیں نکلتے۔

خورشید :۔ باہر بھی ہوتا ہے ــــ

ناصر :۔ تم گدھے ہو ــــ (ہنس کر) آخر تمھاری سمجھ میں آتا کیوں نہیں؟

خورشید :۔ (دوسری سگریٹ جلاتا ہے)

ناصر :۔ (غصے میں) تم بولتے کیوں نہیں؟

خورشید :۔ کیا خاموشی کچھ کہنے سے قاصر ہے؟ کچھ کہنے کے لیے لفظوں کی شرط تم ضروری کیوں سمجھتے ہو۔

ناصر :۔ (دانت پیس کر) دیکھو خورشید! میں تھپڑ مار دوں گا۔ میرے سامنے بکواس مت کیا کرو۔ آج تم دن بھر گھر ہی میں گھسے بیٹھے رہے؟ تم نے سہ پہر کو آنے کے لیے کہا تھا؟

خورشید :۔ (دھیرے سے) نہیں آسکا۔

ناصر :۔ کیوں؟

خورشید :۔ سید علی آگیا تھا۔

ناصر :۔ سید علی؟ سید علی کون؟

خورشید :۔ اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن!

ناصر :۔ (زچ ہوکر) اُفوہ! تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے!

خورشید :۔ ابا مرحوم کے ایک دوست تھے، میر احمد علی ــــ

ناصر :۔ میر احمد علی؟ وہ تو نہیں جو رحمت نگر کے تعلقہ دار تھے۔

خورشید :۔ ہاں وہی! میر احمد علی کے والد تھے میر رحمت علی۔ سید علی میر احمد علی مرحوم کا بیٹا ہے۔

ناصر :۔ پھر؟

خورشید :- پھر کیا ؟ میں اب تک یہی سمجھتا رہا ناصر کہ زوال ہر شخص کا، ہر حقیقت کا، ہر مظہر کا مقدر ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ میر احمد علی نے اپنی آخری عمر کس عسرت میں گزاری۔ دانے دانے کو محتاج ہو گئے تھے۔ اب رحمت نگر کی حویلی اور میر احمد علی کے آبائی قبرستان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن سید علی ــــ (رک جاتا ہے)

ناصر :- (جلدی سے) کہو کہو! تم چپ کیوں ہو گئے ؟

خورشید :- (دھیمے لہجے میں) سید علی بھی ایسا ہی لا ابالی تھا۔ اس نے اپنے آبائی وقار کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کا کوئی جتن نہیں کیا۔ حالات خراب ہوتے گئے اور ایک دن وہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

ناصر :- پھر ؟

خورشید :- پھر اس نے زندگی کا ایک نیا راستہ اختیار کر لیا۔ گھر جب چھوٹ گیا تو اُسے گھر والے یاد آئے۔ اس نے بہت تھوڑے پیسے سے دلّی میں ایک کاروبار شروع کیا۔ آج وہ اچھی خاصی حیثیت کا مالک ہے۔ اپنے کارخانے میں خود مزدوروں کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کے گھر والے اُس کے ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی دس برس بعد اُسے ان لوگوں کا خیال آیا جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور وہ کل رات یہاں آیا۔ آج دن بھر میں اسی کے ساتھ تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ رحمت نگر گیا ہے۔

ناصر :- کیوں ؟

خورشید :- اپنی حویلی اور اپنے خاندانی قبرستان کی مرمت کروانے کے لیے۔ اس کے پاس نئے کتبے تھے۔ میر احمد علی اور میر رحمت علی کی قبروں کے لیے۔

ناصر :- کتبے ؟

خورشید :- ہاں کتبے۔ وہ چاہتا ہے کہ قبروں کا نشان باقی رہے۔

[چند لمحوں کی خاموشی۔ دیوار گیر گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک]

خورشید :- اور میں بھی یہی چاہتا ہوں ناصر ــــ

[خاموشی۔ دور بجو بابا کے لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلنے کی مسلسل آوازیں]
۔فیڈ آوٹ۔

فیڈان :۔
وقت کے گزرنے کا تاثر ـــ
[موسیقی کی ایک طربیہ لہر ـــ ہواؤں کا شور۔ پتے کھڑکھڑاتے ہیں۔
پرندوں کی آوازیں ـــ کھیت میں ٹریکٹر چل رہا ہے ـــ دور سے
آتی ہوئی کسی بیل گاڑی کی چرچراہٹ، بیلوں کے گلے میں لٹکی ہوئی
گھنٹیاں بجتی ہیں۔]

امی :۔ (پکارتے ہوئے) فوزیہ ـــ او فوزیہ!

فوزیہ :۔ (دور سے) آرہے ہیں امی!
[بھاگتی ہوئی آتی ہے۔ سانس پھول رہا ہے]

فوزیہ :۔ (خود کو سنبھالتے ہوئے) جی امی!

امی :۔ (رک کر) کہاں تھی؟

فوزیہ :۔ (شرمائی ہوئی ہنسی) اللہ امی۔ آپ تو ـــ

امی :۔ (جلدی سے) اوہ! اچھا۔ یہ بتاؤ کہ سامان ٹھیک کرلیا۔

فوزیہ :۔ ہمیں کرنا ہی کیا ہے۔ کپڑوں کے کچھ جوڑے رکھ لیں گے ـــ بس۔

امی :۔ اور کتابیں؟

فوزیہ :۔ وہ سب پہلے ہی رکھ لی ہیں ـــ

امی :۔ تو تم امتحان کے بعد واپس آؤ گی یا وہیں رک جاؤ گی؟

فوزیہ :۔ (دھیرے سے شرماکر) اب یہ ہم کیا جانیں ـــ؟

امی :۔ اوہ ـــ اچھا خیر ـــ دیکھا جائے گا۔ وقت کتنا ہوا ہے!

فوزیہ :۔ دو بج گئے!

امی :۔ دو بج گئے؟

فوزیہ :۔ جی!
امّی :۔ افوہ! تم لوگ کتنی لاپروا ہو۔ دستر خوان بچھواؤ۔
فوزیہ :۔ بھائی جان ابھی تک نہیں آئے ــــ
امّی :۔ کون؟ خورشید؟ ابھی نہیں آیا ـــ؟ کہاں ہے؟
فوزیہ :۔ ٹیوب ویل پر ـــ صبح سے وہیں ہیں۔
امّی :۔ صبح؟ لیکن میں نے صبح بھی اسے نہیں دیکھا۔
فوزیہ :۔ وہ تڑکے ہی چلے گئے تھے۔ ہم جاگ رہے تھے اس وقت۔ ان کے لیے چائے بنا دی تھی۔
امّی :۔ اور ناشتہ؟
فوزیہ :۔ کباب تل دیے تھے اور دو پراٹھے ڈال دیے تھے۔
امّی :۔ (خوش ہو کر) شاباش! میں تو صبح سے ہلکان ہو رہی تھی کہ اُس نے شاید اب تک منہ میں کچھ نہیں ڈالا۔ خیر۔ دستر خوان پر کھانا لگواؤ ـــ وہ آہی رہا ہوگا۔
فوزیہ :۔ (منہ بنا کر) آچکے وہ! ہم ابھی جا کر انھیں بلا لاتے ہیں۔ (جاتی ہے)
امّی :۔ (پکارتے ہوئے) بچو بابا! او بچو بابا!
بچو بابا :۔ (دور سے) آئے رہے ہیں۔
[لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے ہیں ـ]
امّی :۔ نوید ابھی تک اٹھا نہیں؟
بچو بابا :۔ سوئے رہے ہیں چادر تانے۔ بڑے بھیّا اُن سے کہہ گئے رہیں کہ آج بوائی کا کام وہی دیکھ لیں گے۔ نوید بھیّا کو سام تک سہر بھی جانا ہے نا؟
امّی :۔ اچھا ـــ اب جا کر جگا دو اُسے۔ خورشید صبح سے کھیتوں پر لگا ہوا ہے اور نواب صاحب ہیں کہ ابھی سو رہے ہیں۔ کہو اٹھے۔ کھانا لگ رہا ہے۔
بچو بابا :۔ اور بڑے بھیّا ـــ؟
امّی :۔ فوزیہ انھیں بلانے گئی ہے۔

[بجّو بابا لاٹھی ٹیکتے ہوئے جاتے ہیں]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

فیڈ ان:۔

[ٹریکٹر کا شور ــــ]

فوزیہ :۔ (پکارتے ہوئے) بھائی جان ــ بھائی جان ۔

[ٹریکٹر کا شور]

فوزیہ :۔ (جھنجھلا کر) بھائی جان ــ (دانت پیس کر) بھائی جان !

[ٹریکٹر رک جاتا ہے]

ہمایوں :۔ (دھیرے سے) اُفوہ ! تمھیں غصّہ کیوں آرہا ہے ؟

فوزیہ :۔ اتنی دیر سے چلاّ جو رہے ہیں ۔

[خورشید دوڑتا ہوا آتا ہے ۔ پاس آکر ایک سگریٹ سلگاتا ہے]

خورشید :۔ (ہنس کر) اوہ فوزیہ اور ہمایوں ! تم لوگ یہاں کیسے ؟

فوزیہ :۔ (منہ بنا کر) یہاں کیسے ؟ کچھ ہوش بھی ہے ۔ ڈھائی بجنے کو ہیں ۔ امی نے بلوایا ہے ۔ کھانا کھالو ۔ توبہ ۔ پکارتے پکارتے گلا سوکھ گیا ۔

خورشید :۔ (ہنس کر) تو اتنا چلانے کی ضرورت کیا تھی ۔ تم نہ آتیں جب بھی میں آجاتا ۔ ہمایوں ! تم اسے سمجھاؤ ! بہت جلد پارہ چڑھ جاتا ہے ۔

ہمایوں :۔ (گڑبڑا کر) جی بھائی جان !

خورشید :۔ تم لوگ آج جا رہے ہو نا ؟

فوزیہ :۔ ہاں ہاں ہاں ! اتنی بھی خبر نہیں رہتی ہماری ۔ صبح سے شام تک بس کھیت کھیت کھیت ۔

خورشید :۔ (ہنس کر) اور نوید بھی تم لوگوں کے ساتھ ہی جائے گا ۔

ہمایوں :۔ جی بھائی جان !

خورشید :۔ اور تمھارا امتحان کب سے ہے ؟

فوزیہ :۔ توبہ ہے! ہم نہیں بتاتے۔ سب کچھ یہیں پوچھ لو گے ـــ
خورشید :۔ چلو ـــ چلتے ہیں ـــ
[سب ساتھ جاتے ہیں]

۔فیڈ آؤٹ۔

فیڈان :۔
[برتنوں کی کھنک ـــ دور کہیں بچو بابا لاٹھی ٹیکتے ہوئے جا رہے ہیں]

امّی :۔ (پکارتے ہوئے) نوید ـــ او نوید۔
نوید :۔ (دور سے) آیا امّی! (آتا ہے)
امّی :۔ بیٹھو تم لوگ! کھانا لگ گیا ـــ
خورشید :۔ ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں نواب صاحب!
نوید :۔ اب آپ نے فارم سنبھال لیے ہیں تو مجھے کیا فکر؟ (ہنس دیتا ہے)
خورشید :۔ دیکھو! تم وہاں پہنچ کر ناصر کو چند دنوں کے لیے بھیج دینا۔ اور فوزیہ تم! امتحان ختم ہوتے ہی چلی آنا۔ اب کے آموں سے پیڑ لدے ہوئے ہیں۔ گرمیاں یہیں گزارنا تم دونوں۔ کیوں ہمایوں؟
ہمایوں :۔ جی بھائی جان ـــ
خورشید :۔ اور امّی! آپ بچو بابا کو نوید کے ساتھ بھیج دیجیے۔ یہ تو دن بھر کارخانے میں لگا رہے گا۔ گھر کی دیکھ بھال صرف بوا پر چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ وہ ایک بھلکڑ ہیں۔
امّی :۔ (دھیرے سے) بچو بابا تو خود ہی جانا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے تمھارے ابا کی قبر مرمت کروانی ہے نا ـــ
خورشید :۔ اوہ ہاں! دلّی سے سید علی نے نیا کتبہ بھیج دیا ہوگا۔ خط آیا تھا اس کا۔ نوید! تم منشی جی سے پوچھ لینا۔ کتبہ اب تک آ گیا ہوگا۔ اکاؤنٹنٹ صاحب سے کہنا کہ اس سال کا پورا حساب جلد تیار کر ڈالیں۔ پھر وہ نئی مشینیں منگوانی ہیں۔

امّی :۔ (جھنجھلا کر) اُفّوہ! خدا کے لیے پہلے کھانا کھالو پھر یہ بکواس کرنا۔ سالن رکھے رکھے ٹھنڈا ہو گیا ـــ (پکارتے ہوئے) بچّو بابا ـــ اے بچو بابا۔

بچو بابا :۔ (دور سے) آئے رہے ہیں۔

[لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے ہیں]

بچو بابا :۔ کا ہے؟

امّی :۔ دیکھو بوا سے کہو سالن کا ڈونگا پھر سے گرم کر دیں۔ (بچو بابا جاتے ہیں)

خورشید :۔ ہاں! اور نوید ـــ یہ بھی دیکھ لینا کہ جو کھاد شہر سے منگوائی تھی اس کی بوریاں منشی جی نے گودام سے اٹھوالیں کہ نہیں۔ میں نے ناصر کو دسہری کی نئی قلموں کے لیے بھی لکھ دیا تھا۔ کوئی پچاس پیڑ ـــ سمجھے؟ پوچھ لینا ـــ

امّی :۔ (تنبیہہ کے انداز میں) خورشید ـــ

خورشید :۔ (گڑبڑا کر) جی امّی ـــ

امّی :۔ تم پھر کھانا ٹھنڈا کرواؤ گے ـــ (بچو بابا آتے ہیں)

بچو بابا :۔ کھیت پر سے ہرواکر آئے رہا۔ تمھیں بلاوے کے لیے۔

خورشید :۔ اچھا اچھا ـ کیوں؟

بچو بابا :۔ ای کہ گیا۔ بے کہ جائے کے ٹیوب ویل کی مسین ٹھیک کر دیو۔ کچھ گڑبڑ پڑ گئی ہے۔

[خورشید اٹھتا ہے]

خورشید :۔ بس (منہ چلاتے ہوئے) میں کھا چکا کھانا!

امّی :۔ (غصّے میں) توبہ ہے خورشید! اس طرح کھانا کھایا جاتا ہے۔ بیٹھو ابھی۔ مشین جائے چولھے بھاڑ میں۔

[سب ہنستے ہیں]

[طربیہ موسیقی کی ایک طویل لہر۔ رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہے]

دیوار

آوازیں

۱۔ چمپا : نوکرانی۔
۲۔ شانتی : عمر چالیس کے لگ بھگ۔ جذباتی لہجہ۔
۳۔ راج : شانتی کا دیور۔ عمر شانتی کے آس پاس۔
۴۔ رائے صاحب: شانتی کے سسر۔ بوڑھے۔
۵۔ گیتا : شانتی کی دوست، ہم عمر۔
۶ سانیال صاحب: رائے صاحب کے دوست۔
۷ ـــــ ایک آواز ـــــ

ابتدائی موسیقی ـــــ راگ مالکوس کے اُونچے سُروں میں ایک گت۔

۔فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان :

[رات کا سناٹا ـــــ ہوا کا شور ـــــ طوفان ـــــ لگتا ہے
بیچ بیچ میں سیٹیاں سی بجتی ہیں ـــــ دور کہیں کھڑکی کے پٹ
اچانک کھلتے ہیں ـــــ اڑتے ہوئے کاغذوں کی پھڑ پھڑاہٹ۔
کانچ کے ٹوٹنے کی آواز ـــــ]

ایک آواز : (دور سے آتی ہوئی، گونجیلی اور بھاری)
شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

۔فیڈ آؤٹ۔

[ہوا کا شور]
قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ۔
دروازے پر دستک ـــــ

چمپا : مالکن ـــــ مالکن ـــــ!

(دروازہ کھلتا ہے)

شانتی : کون ؟ چمپا ؟ کیا بات ہے ؟

چمپا : (گھبرایا ہوا لہجہ) جھکڑ چل رہے ہیں مالکن ـــــ ابھی ـــــ ابھی اچانک کیسی آواز آئی تھی ! کہیں کوئی دیوار گری ہے ـــــ

شانتی : دیوار ؟ (رک کر) نہیں ـــــ جاؤ ـــــ تم سو جاؤ ـــــ میری چنتا مت کرو ! (دروازہ بند کر لیتی ہے)

[موسیقی کی ایک لہر
ہوا کا شور]

شانتی : (ہانپتے ہوئے) پاگل، پریشان ہوا ـــــ یہ کسے ڈھونڈ رہی ہے ؟ دور تک پھیلا ہوا، گھنا، گمبھیر اندھیرا ـــــ موت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ـــــ اوف ـــــ اوف ـــــ یہ کیسی بے کلی ہے ؟ اور ـــــ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دیواروں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کی ایک لہر ـــــ سب کچھ بکھیر دیتی ہے ـــــ

[ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہوئے کاغذ ـــــ دور سے آتی ہوئی ایک دیوانہ وار قہقہے کی گونج]

شانتی : (ہانپتے ہوئے) یہ کیا ہو رہا ہے ؟ میں اچانک بکھرتی کیوں جا رہی ہوں ؟ یہ کیسی الجھن ہے ؟ سانسوں میں رچی ہوئی یہ کیسی مہک ہے ؟ گئے دنوں کی ؟ (اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

ـ فیڈ آؤٹ ـ

[وقفہ]

[صبح کا تاثر ـــــ پرندوں کے چہچہے]

شانتی : تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو راج ؟

راج : (چونک کر) اوہ ـــــ مادام شانتی لتا ؟ تو تم ـــــ دوسروں کی سوچ کے بارے میں بھی پریشان ہو سکتی ہو ؟ کیوں ؟

شانتی : بکومت ـــ میں نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ کبھی میں پریشان تھی ـــ اور ہوتی بھی تو کیوں ؟

راج : دیکھیے مادام ! اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہنا، مانا کہ اچھی عادت ہے، مگر اس سے ملتا کیا ہے ؟

شانتی : (بگڑ کر) دیکھو راج ـــ یہ سائیکلوانالیس کا چکر چھوڑ دو، سچائی جو کچھ بھی ہوتی ہے، دکھائی دیتی ہے ـــ دیکھو ـــ میں کتنی سُکھی، کتنی شانت دکھائی دیتی ہوں۔ ہے کہ نہیں ؟ (ہنستی ہے)

راج : (رک کر) دیکھو بھائی ـــ وہ بھکاری ـــ دکھنی رام ـــ جو ہر شام الفریڈ پارک کے گیٹ پر کھڑا دکھائی دیتا ہے ـــ اس کا نام دکھنی رام ہے ـــ اور وہ بھکاری ہے ـــ سمجھیں ؟ ٹھیک ہے، تم مسز شانتی لتا ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی ـــ مگر یہ شانتی صرف تمہارے نام میں ہے ـــ ہے کہ نہیں !

شانتی : تو کیا ـــ سچ مچ، میں تمہیں اشانت اور بے چین دکھائی دیتی ہوں ؟

راج : ہاں کہ کہ میں اس دیوار کو توڑنا نہیں چاہتا جو تم نے اپنی آتما کے چاروں اور چن رکھی ہے !

شانتی : (تنبیہ کے انداز میں) راج !

راج : (دھیمے لہجے میں) سن رہا ہوں ـــ اور تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوا ہوں !

شانتی : (بڑبڑاتے ہوئے) دیوار ! دیوار !! دیوار !!!

فیڈ آن :

[ہوا کا شور ـــ دور ایک قہقہے کی گونج جو دھیرے دھیرے ڈوب جاتی ہے۔]

فیڈ آن :

[مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیاں ـــ شنکھ ـــ دور سے آتی ہوئی، کیرتن کی دھیمی دھیمی آواز ـــ]

(ملے جلے قدموں کی چاپ)

شانتی : دیکھو ــــ ادھیڑ عمر کی وہ عورت ــــ وہ سفید ساری میں ــــ اس کا نام سندھیا ہے ــــ کیرتن منڈلیوں کے ساتھ، پچھلے پچیس برسوں سے وہ اسی طرح منجیرہ بجاتی رہتی ہے۔ اور ــــ اور راج! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ہم دونوں، ایک ہی بستی میں، جنمے تھے۔ دس بارہ برس کی عمر تک، ہم ساتھ کھیلتے تھے ــــ بنوں میں اور کھیتوں میں ــــ پھر اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ اور اُس کا پتی مر گیا تھا ــــ سانپ نے کاٹ لیا تھا اُسے ــــ پھر اُسے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا ــــ پھر وہ اپنے مائیکے بھی نہیں آئی تھی کیونکہ اس کے پتا کا دیہانت ہو چکا تھا اور گھر والے اُسے سوئیکار کرنے پر تیار نہیں تھے ــــ

(ہانپنے لگتی ہے)

راج : (پکارتے ہوئے) بھابی ــــ بھابی (گھبرا کر) بھابی ــــ!

شانتی : پھر ــــ وہ پریاگ چلی آئی تھی ــــ اور جب سے اب تک وہ اسی مندر میں کیرتن منڈلیوں کے ساتھ اسی طرح بیٹھی منجیرہ بجاتی رہتی ہے ــــ اُس نے مجھے ابھی ــــ دیکھا تھا، مگر پہچانا نہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ــــ وہ مجھے پہچاننے سے ڈرتی ہے ــــ اور میں ــــ میں بھی اسے پہچاننے سے ڈرتی ہوں ــــ تم یہی سوچ رہے ہو نا! کیوں؟

راج : یہ تم ــــ اچانک تم کیسی باتیں کرنے لگیں؟

شانتی : (کھلکھلا کر ہنستی ہے) میں نے تمہارے من کا چور پکڑ لیا نا؟ مگر ــــ مسٹر راج ونش! ایک بات گرہ میں اچھی طرح باندھ لو ــــ میں اسے پہچاننے سے ڈرتی نہیں ــــ یہ اور بات ہے کہ میں اسے پہچاننا نہیں چاہتی!

راج : کیوں؟

شانتی : اس لیے کہ اسے پہچاننے کا مطلب اُن بھولے بسرے دنوں کو یاد کرنا ہے جو میرے لیے اب کوئی بھاؤ، کوئی ارتھ نہیں رکھتے ــــ جس روز تمہارے بھیا فرنٹ پر مارے

گئے ___ اسی دن ___ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے سند ھیا یا شکنتلا یا پاروتی یا رجنی نہیں بننا ہے ___ یہ نام اُن لڑکیوں کے ہیں ___ جو متھرا، پریاگ، وارانسی اور اجودھیا کے مندروں میں ایسی ہی کیرتن منڈلیوں کے ساتھ بیٹھی ___ منجیرہ بجا رہی ہوں گی ___ یا بے جان مورتیوں کو پنکھا جھل رہی ہوں گی ___ یا ___ یا پھر ___

راج : تم رک کیوں گئیں ___ ؟ آگے کیا کہنا چاہتی تھیں تم ؟

شانتی : یا پھر ___ کسی ریڈ لائٹ ایریا میں ___ جاگ رہی ہوں گی رات گئے ___ بدبو دار پسینے میں نہائے ہوئے کسی اجنبی کے ساتھ ___ فائیو اسٹارز تک تو پہنچنے سی رہیں ___ (ہنستی ہے)

[وقفہ ___ ہوا کا شور ___ اسی کے ساتھ حزنیہ موسیقی کی ایک لہر دھیرے دھیرے ڈوبتی ہوئی]

[بھاری قدموں کی گونج]

رائے صاحب : (نرم لہجے میں) شانتی ! بیٹی شانتی لتا ___ !

شانتی : جی ___ بابو جی !

رائے صاحب : تم کب سے اسی طرح بیٹھی ہوئی ہو ؟ کب تک یوں ہی بیٹھی رہو گی ؟

[شانتی کی سسکیاں]

رائے صاحب : ارے ! پگلی ! تم تو رونے لگیں ___ رونا تو مجھے بھی چاہیے تمہارے ساتھ۔ تم سمجھتی ہو کہ تم اکیلی ہو گئی ہو سُبھاش کے دیہانت کے بعد ___ کیوں ؟ مگر ___ میں ___ میں بھی تو ادھورا ہو گیا ہوں بیٹی ___ وہ میرا بڑا بیٹا تھا نا ___ [آواز بھرا جاتی ہے]

[پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ]

راج : بابوجی ! بابوجی !

رائے صاحب : (چونک کر) کون ؟ راج ___ کیا ہے بیٹے !

راج : آپ رو رہے ہیں بابوجی!

رائے صاحب : نن — نہیں تو — میں رو تو نہیں رہا ہوں — [مصنوعی ہنسی] دیکھو راج! ایسا کرو! تم شانتی کو ذرا محنت سے پڑھاؤ! وہ پڑھنا چاہتی تھی نا! اور سبھاش بھی تو یہی چاہتا تھا — (وقفہ) سبھاش بھی یہی چاہتا تھا نا!

راج : (دھیرے سے) ہاں —

[ہوا کا شور] فیڈ آؤٹ —

شانتی : (پڑھتے ہوئے) — WE DO NOT KNOW MUCH OF THE FUTURE
EXCEPT THAT FROM GENERATION TO GENERATION
THE SAME THINGS HAPPEN AGAIN AND AGAIN
MEN LEARN LITTLE FROM OTHERS' EXPERIENCE
BUT IN THE LIFEOF ONE MAN,NEVER
THE SAME TIME RETURNS— ———

[کتاب بند کر دیتی ہے۔ آواز کے ساتھ ، ماچس جلانے کی آواز]

شانتی : (اپنے آپ سے) بکواس۔ سب بکواس ہے —

گیتا : (جمائی لے کر) اوشانتی — شانتی — اب لائٹ آف کرو اور سو جاؤ — تمھیں پتا ہے، رات کے کتنے بجے ہیں —!

شانتی : رات سونے سے چھوٹی تو نہیں ہو جاتی گیتا! کیوں؟

گیتا : ہو جاتی ہے میری جان! ہو جاتی ہے چھوٹی۔ آزما کر دیکھ لو — اور — یہ کیا — تم نے پھر سگریٹ سلگا لیا — گندی بات! چھوڑ دو یہ لت — نہیں تو لوگ کہیں گے کہ رائے صاحب کی بہو ولایت جا کر ایک دم میم بن گئی — (چمکارتے ہوئے) سو جاؤ اب — آؤ — آؤ! مجھ سے لپٹ کر سو جاؤ! (دھیرے سے) آؤ!

[سوئچ آف کرنے کی آواز]

[حزینہ موسیقی کی ایک لہر]

شانتی : میں نے کہا نا کہ میں سندھیا یا شکنتلا یا پاروتی یا رجنی نہیں بننا چاہتی تھی۔ مجھے بھجن کیرتن سے زیادہ دلچسپی ایلیٹ اور سارتر اور کامیو سے تھی ___ میں بھول جانا چاہتی تھی ___ سب کچھ ___ بھول جانا چاہتی تھی ___

راج : بھیا کو بھی!

شانتی : ہاں! موت ہم سے جس کسی کو چھینتی ہے، اُسے مٹا بھی دیتی ہے۔ اسے یاد کرنا اپنے آپ کو کشٹ دینا ہے ___ اور اُنھیں بھی کشٹ دینا ہے جو ہمیں سُکھی دیکھنا چاہتے ہیں! اس میں میرا اپنا سوارتھ بھی رہا ہوگا ___ پر ___ سچ مانو راج، مجھے اپنے آپ سے زیادہ بابوجی کی چنتا تھی ___ جس روز میں انگلینڈ سے واپس آئی اور بابوجی نے مجھے دیکھا، تو اُن کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا ___

[سڑک کا شور۔ ٹریفک۔ موٹر کا ہارن
اچانک بریک لگتے ہیں۔]

رائے صاحب : راج! بیٹے ___ ذرا دیکھ بھال کر موٹر چلاؤ!

راج : سوری بابوجی!

رائے صاحب : (ہنس کر) مجھے اپنا نہیں، شانتی کا خیال ہے۔ ابھی ابھی تو وہ ولایت سے لوٹی ہے ___ کہے گی کہ ہم گنوار NATIVE لوگوں کو گاڑی چلانی بھی نہیں آتی ___

[گاڑی رکتی ہے۔ سب گاڑی سے اترتے ہیں۔ دروازے بند ہونے کی آواز]

سانیال صاحب : اوہ ___ رائے صاحب! ہو کو لے کر آ گئے ایرپورٹ سے ___!

رائے صاحب : تم؟ سانیال؟ لیکن جا کہاں رہے ہو؟ چلو، اندر چلو!

سانیال صاحب : چلتا ہوں ___ میں تو یہ سوچ کر واپس جا رہا تھا کہ تم پتا نہیں کب واپس آؤ!

[ملے جلے قدموں کی چاپ۔ (وقفہ) سب بیٹھ جاتے ہیں]

سانیال صاحب : کیسا رہا تمھارا سفر؟

شانتی : بہت اچھا! اور EXCITING

رائے صاحب : شانتی! اوہ! اب تو ڈاکٹر شانتی لتا کہنا چاہیے ـــــ (ہنستے ہیں)

شانتی : جی بابو جی!

رائے صاحب : ایسا ہے کہ تم جا کر تھوڑا آرام کر لو ـــــ راج ـــــ سامان رکھوا دیا سب ٹھیک ہے!

راج : ہاں!

رائے صاحب : تو جاؤ۔ شانتی کو لے جاؤ! اس کمرے میں جو تمھاری سورگیہ ماں کا کمرہ تھا۔ شانتی اُسی کمرے میں رہے گی ـــــ

[جاتے ہوئے قدموں کی چاپ]

سانیال صاحب : تم کسی سوچ میں ڈوب گئے رائے صاحب!

رائے صاحب : نہیں سانیال! (ایک گہرا سانس لیتے ہیں) سوچ کر بھلا کیا ملتا ہے ـــــ سبھاش گیا۔ پھر اس کی ماں! ولو دی اپنی سسرال میں مگن ہے۔ راج نے سارا بزنس سنبھال لیا ہے۔ مجھے اب کوئی چنتا نہیں۔ شانتی بھی خوش دکھائی دیتی ہے! کیوں؟ اب مجھے کوئی چنتا نہیں!

سانیال صاحب : ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔ تمھارا فیصلہ ٹھیک تھا۔

رائے صاحب : ہاں ـــــ (رک کر) ٹھیک ہی تھا۔ اصل میں شانتی کا گریجویشن ہوتے ہی یہ الجھن سامنے آگئی تھی کہ اب کیا ہو؟ وہ سبھاش کو پہلے سے زیادہ یاد کرنے لگی تھی۔ اسی لیے تو میں نے ـــــ یہ طے کیا کہ اپنا ایم۔ اے پورا کرنے کے بعد وہ دو چار برس کے لیے باہر چلی جائے ـــــ

[موسیقی کی لہر]

راج : (قریب آتے ہوئے) ہلو بھابی!

شانتی : ہلو راج!

راج : یہ کتاب بند کرو ـــــ اور ـــــ اور مجھ سے باتیں کرو!

شانتی : (مضمحل ہنسی کے ساتھ) تم میرے چپ رہنے سے ڈرتے ہو شاید !

راج : ہاں ! ڈرتا ہوں !

شانتی : کائیر کہیں کے ــــ (ہنستی ہے)

ــ وقفہ ــ

راج : تمہیں WEST پسند آیا!

شانتی : ہاں ! (ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتی ہے)

راج : یہ لت تم نے کیوں لگالی ــــ

شانتی : یہ بھی ایک سادھن ہے جینے کا۔ اسے لت کہنا ٹھیک نہیں۔ جس طرح ہم شاپنگ کرتے ہیں اور پارٹیوں میں جاتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں ــــ اور ریڈیو سنتے ہیں اور فلمیں دیکھتے ہیں۔

راج : یہ سب اپنے شونیہ کو، من کے خالی پن کو، سونے پن کو بھرنے کا ایک بہانہ ہے !

شانتی : ACADEMIC باتیں کروگے تو مجھے ہنسی آجائے گی!

راج : تو کیا میں غلط کہہ رہا تھا ــــ

شانتی : ہاں ! تم بکواس کر رہے تھے۔ RUBBISH ایسی باتوں کا کوئی بھاؤ نہیں ہوتا۔

راج : تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو بھابی!

شانتی : دھوکا دینا، سندھیا یا شکنتلا یا پاروتی بننا ہے۔ بھجن کیرتن، گیتا پاٹھ، مندر، دیوداسیاں BROTHELS میں اس سب سے بچنا چاہتی تھی ! میں اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتی تھی!

راج : پھر ــ بھلا چاہتی کیا تھیں ؟

شانتی : (ہنستی ہے) بتاؤں ؟ (پھر ہنستی ہے)

راج : (پُرخیال انداز میں) ہوں ! بتاؤ !

شانتی : (سنجیدگی کے ساتھ) میں ماں بننا چاہتی تھی ــــ مگر ــــ تمہارے بھیا ــــ (رک کر) یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ــــ اور راج ! سچ پوچھو تو اس کامنا میں بھی ایک سوارتھ چھپا ہوا تھا ــــ ماں بننا ــــ یہی ایک اکیلا سادھن ہے عورت کے لیے

اپنی پہچان کا اور اپنے ادھورے پن کے احساس سے بچنے کا ـــــ ماں پوری عورت ہوتی ہے۔ سمجھے!

راج : (پرخیال انداز میں) ہوں ـــــ!

شانتی : (اداسی سے) اس حویلی میں سب کچھ ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے ـــــ تم نے بزنس سنبھال رکھا ہے۔ میں کالج میں پڑھاتی ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ دھن دولت، نوکر چاکر ـــــ مجھے کسی کی محتاجی نہیں۔ تمھاری بھی نہیں۔ بابوجی ـــــ سب کچھ ـــــ اس طرح جما گئے تھے کہ اُن کے بعد بھی کہیں بکھراؤ یا ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی۔ سارے سُکھ ہیں میرے پاس۔

راج : تم یہ نہیں سوچتیں بھابی کہ تمھیں اس سارے سکھ کا کتنا بڑا مول چکانا پڑا ہے ـــــ چکانا پڑ رہا ہے۔

شانتی : (ہنستے ہوئے) پھر وہی INTELLECTUAL باتیں!

راج : (خفا ہوکر) وہ گھنے جنگل ـــــ جن کے دامن میں چھپی ہوئی بستی کی دُھول تمھارا بچپن ہے ـــــ ندی کا وہ کنارا ـــــ جہاں تم سندھیا اور پاروتی اور رجنی اور شکنتلا کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں ـــــ ہوا کی ایک آزاد، منچلی اور شکتی وان لہر کی طرح ـــــ تم بھول گئیں وہ سب!

شانتی : (تیز لہجے میں) ہاں!

راج : تمھیں یاد نہیں آتا اپنا وہ نشچل اور نربھے روپ!

شانتی : (ہانپتے ہوئے) نہیں!

راج : تم یہ نہیں سوچتیں کہ تم نے اپنے چاروں اُور دیواریں چُن رکھی ہیں!

شانتی : (ہانپتے ہوئے) نہیں ـــــ

راج : اور تم آپ اپنے وچاروں کی بندی بن کر رہ گئی ہو!

شانتی : (روہانسی ہوکر) نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ

راج : ٹھیک ہے! ایک بار آدمی اپنی آتما کا سودا کرے تو پھر ـــــ وہ سدا کے لیے چِنتا

مکت (चिन्तामुक्त) ہو جاتا ہے ـــــ تمہارے سُونے پن کی لپٹیں مجھ تک پہنچتی ہیں
ـــــ مگر تم ـــــ تم اسے سویکار نہیں کرنا چاہتیں!

شانتی : (چیخ کر) راج ـــــ

[پس منظر سے لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر]

-فیڈ آوٹ-

(وقفہ)

فیڈ ان ـــــ

[شام کا تاثر۔ دور مندروں کے گجر بجتے ہوئے۔ ہوا کا دھیما شور۔ اس شور کے ساتھ کبھی مندر میں کیرتن منڈلی کے گاین کی کوئی لہر ابھرتی ہے ـــــ اسی پس منظر میں شانتی کی آواز سنائی دیتی ہے، خود کلامی کے انداز میں پڑھتے ہوئے :]

شانتی : یہ دھوپ کنارا ـــــ شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ : نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو ـــــ

گیتا : (تالیاں بجاتے ہوئے) واہ ـــــ واہ ـــــ واہ واہ ـــــ (چونک کر) ارے! تم رک کیوں گئیں ـــــ؟

شانتی : اتنا بہت ہے ــ گیتا ــ ! ENOUGH FOR TODAY ۔
گیتا : یہ تم اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں کر کچھ پڑھ رہی تھیں ــ
شانتی : فیض کی ایک کویتا ــ اسے پڑھ رہی تھی اور اس کے مادھیم سے ــ
گیتا : اوہ شانتی ــ تم پھر چپ ہو گئیں ۔
شانتی : اس کے مادھیم سے شاید باتیں بھی کر رہی تھی اپنے آپ سے ۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ــ !
گیتا : کیا ہوتا ہے ؟
شانتی : کہ ہم دوسروں کے لکھے میں اپنے آپ کو پڑھتے ہیں ۔
گیتا : زیادہ PHILOSOPHICAL مت بنو ! چلو ــ باہر چلتے ہیں ــ
شانتی : باہر ؟
گیتا : ہاں ! آندھی کا زور ٹوٹ چکا ــ آسمان صاف ہے ــ اور شام ہونے والی ہے ــ مندر میں پروہت پریکرما کر رہے ہوں گے ! چلو ! باہر چلیں ــ
شانتی : نہیں ــ میں ابھی ابھی تو لوٹ کر آئی ہوں باہر سے ــ
گیتا : (ہنس کر) ! TRULY PHILOSOPHICAL تم تو یہیں بیٹھی ہو دوپہر کے بعد سے ۔
شانتی : ایک جاترا بیٹھے بیٹھے بھی کی جاتی ہے ــ
گیتا : اوہ ــ (منہ بنا کر) ! METAPHYSICS ۔
شانتی : اتنا برا کار نہیں ہوتی ــ فزکس اور میٹا فزکس میں اتنی دوری نہیں جتنی کہ دکھائی دیتی ہے ــ
گیتا : اوہ ! وَنڈر فُل ــ (مذاق کے انداز میں) تو تم باہر کہاں کہاں ہو آئیں ــ ؟
شانتی : لمبی کہانی ــ پھر سنائیں گے !
گیتا : کیوں ؟ ابھی کیوں نہیں ؟
شانتی : میں نے بچپن میں ایک گیت سنا تھا ــ گاؤں کی سہاگنوں کو گاتے ہوئے ۔
گیتا : (پُر خیال انداز میں) ہوں !

شانتی : مجھے اس گیت کے بول یاد نہیں ___ بہت کچھ بھول چکی ہوں ۔ اُن دنوں کی اُور مڑکر دیکھتی ہوں تو بیچ میں ___ اتنا گہرا ___ دھند کی ایک دیوار سی آجاتی ہے ۔

گیتا : تمھیں اس گیت کا خیال کیسے آیا ؟

شانتی : ہر خیال کسی نہ کسی دوسرے خیال سے جُڑا ہوتا ہے ۔ یہ تو ایک سلسلہ ہے ۔ ضروری نہیں کہ اس سلسلے کی سب کڑیاں ملتی جائیں ___ کہیں کہیں ___ یہ سلسلہ پکڑ میں نہیں آتا ___

گیتا : وہ گیت ؟

شانتی : ہاں ! اُس کے بول یاد نہیں آرہے ہیں اس سمے ___ مگر بھاؤ یاد ہے ___

گیتا : کیا ___ ؟

شانتی : یہ برہن کا گیت ہے ___ جو انگنائی میں لگے ہار سنگھار کی اُور دیکھتی ہے ۔ پھر کہتی ہے ___ ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں ___ مگر میں سُونی ہوں ___ میرے بدن پر پھول کھل اٹھے ___ مگر میں سُونی ہوں ___ میری آتما میں پرندوں کے چہچہے گونج رہے ہیں ___ مگر میں سُونی ہوں !

گیتا : (بھرائی ہوئی آواز میں) اور ؟ اور ؟ اور ؟

شانتی : اس سونے پن کو بھرنے کے لیے ___ میں کب سے بے چین ہوں ۔ تم آتے کیوں نہیں ___ آؤ ___ ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں ___ میرے بدن کی ٹہنی تمھیں پکار رہی ہے ___ آؤ ! ان پھولوں کو چُن لو ___ میری آتما میں چہچہاتے پرندوں کی پکار سنو ! اِن کے کنٹھ پیاسے ہیں ۔ بہتے پانی کی اٹوٹ دھارا نہ سہی ___ تم اُوس کی کچھ بوندیں ہی لے کر آجاؤ ___ آجاؤ ___

گیتا : (اپنے آپ سے) آجاؤ ! آجاؤ ___

شانتی : تم بہت پیاسی ہو گیتا ! تمھاری آتما ___

گیتا : آتما کیا شریر سے الگ ہے شانتی ؟

شانتی : ایسی باتیں کہی نہیں جاتیں ۔ پوچھی بھی نہیں جاتیں ___

گیتا : پھر؟
شانتی : بس سمجھ لی جاتی ہیں ـــــ
گیتا : (پرُخیال انداز میں) ہوں!

[پس منظر سے موسیقی کی ایک نرم، دھیمی لہر]

شانتی : ایک روز راج سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ ایسی ہی ایک شام تھی۔ اُس روز بڑے زوروں کی آندھی آئی تھی۔ گُل مہر کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی تھیں اور پھول سارے لان میں بکھر گئے تھے۔

[ہوا کا شور ـــــ جھکڑ ـــــ طوفان۔ FLASH BACK]

راج : (دور سے) بھابی! بھابی!
شانتی : کیا ہے راج! (ہانپتے ہوئے) کیا ہے؟

[قدموں کی چاپ]

راج : ارے! تم تو ہانپ رہی ہو! دیکھو ـــــ باہر کتنا بھینکر طوفان ہے ـــــ
شانتی : ہاں!
راج : اور اندر بھی ـــــ
شانتی : یہ تم کیا کہہ رہے ہو ـــــ اوہ! میں سمجھی ـــــ یہ دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر ہل رہا ہے۔ ایسا کرو کہ وہ سامنے والی کھڑکی بند کر دو! پلیز ـــــ
راج : طوفان تمہارے کمرے میں نہیں ـــــ
شانتی : پہیلیاں مت بجھاؤ راج!
راج : طوفان تمہارے اندر ہے ـــــ
شانتی : (سختی سے) بکو مت ـــــ
راج : دیکھو بھابی ـــــ میں جو کہہ رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو!
شانتی : تم کیا کہنا چاہتے ہو ـــــ (سختی سے) کہو!
راج : پانی میں ابال آجائے تو دیگچی کا ڈھکنا تھوڑا اٹھا دینا چاہیے ـــ نہیں تو ـــــ

شانتی : نہیں تو کیا؟

راج : نہیں تو ـــ نہیں تو سب کچھ بھک سے اڑ جائے گا ـــ

[دور سے آتی ہوئی ایک لمبی چیخ ۔ ہوا کا شور ۔ لرزہ خیز موسیقی]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

شانتی : میں نے اُسی شام گھر چھوڑ دیا۔ میں ورکنگ ویمنز ہوسٹل میں چلی گئی۔ وہاں بڑی مشکل سے میں نے دس دن کاٹے ـــ وہاں مجھے ایسا لگا کہ ایک ساتھ بہت سی دیگچیاں ـــ چولھے پر چڑھی ہوئی ہیں اور اندر سارے کا سارا پانی بھاپ بن چکا ہے۔ میں نے اس ساری گھٹن سے تنگ آکر، گھبرا کر ـــ ہوسٹل بھی چھوڑ دیا ـــ

گیتا : اور اب ـــ تم پھر اُن ہی دنوں کو یاد کر رہی ہو! کیوں؟

شانتی : ہاں ـــ مگر بھلانے کے لیے۔ کسی کو بھلانے کے لیے ـــ کوئی وِیکتی ہو، یا وَستُو، یا سَمے کا کوئی پَل ـــ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ یاد کرنا پڑتا ہے ـــ بھلانے سے پہلے ـــ

گیتا : بھول جاؤ! بھول جاؤ شانتی اور دُکھ مت اٹھاؤ!

شانتی : (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں! مجھے یادوں سے کوئی دلچسپی نہیں یا ACTUALLY, I HATE THEM یہ سب بھولنے ہی کے تو سادھن ہیں ـــ میں نے سارے بزنس کا بٹوارہ کر لیا۔ اپنا SHARE الگ کر کے میں نے بیچ دیا ـــ راج ہی کے ہاتھوں ـــ پھر میں نے یہ کوٹھی خریدلی۔ یہ جگہ پہلے بہت اچھی تھی۔ آس پاس سناٹا تھا ـــ سامنے بہتا ہوا دریا!

[پس منظر سے مندر کی گھنٹیاں]

شانتی : یہ مندر تو ابھی حال میں بنا ہے۔ دو برس پہلے ـــ ایک شام میں ٹہلتی ہوئی اُدھر جا نکلی۔ کیرتن ہو رہا تھا۔ اور اجاڑ چہرے، سونی آنکھوں، مٹ میلے بالوں والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت منجیرہ بجا رہی تھی ـــ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گئی ـــ

گیتا : کون تھی وہ؟

شانتی : سندھیا ـــ (سپاٹ لہجے میں) مگر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار

کر دیا۔ میں نہ تو سندھیا بننا چاہتی ہوں — نہ پاروتی — نہ رجنی — نہ شکنتلا —

گیتا : تم چاہتی کیا ہو!

شانتی : کچھ نہیں — سوائے اس کے کہ اپنا آپ سنبھالے رکھوں۔ وہی بنی رہوں جو کچھ کہ ہوں! شانتی —

گیتا : تو تم سمجھتی ہو کہ اپنے آپ میں کمپلیٹ ہو؟

شانتی : (ہانپتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز میں) نہیں!

گیتا : تم اپنے آپ میں شانت ہو؟

شانتی : (اسی لہجے میں) نہیں!

گیتا : دوسرے کا سہارا چاہتی ہو؟

شانتی : (چیخ کر) نہیں — نہیں — نہیں — میں صرف ماں بننا چاہتی تھی — بس — اور کچھ نہیں — کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں —

[سسکیاں — ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر]

۔ فیڈ آؤٹ ۔

کھڑکی

پہلا منظر ____

کیمرہ شہر کے مختلف علاقوں، بازاروں، دفتروں، بھری پڑی سڑکوں، آتی جاتی ریل گاڑیوں کا ایک مونتاج بناتا ہوا ____ اچانک ایک سنسان کولونی کی ایک گلی پر رُک جاتا ہے۔ گلی کا لانگ شاٹ۔ پھر ایک بند کھڑکی دکھائی دیتی ہے۔ کیمرہ پَین کرتا ہوا اُس کھڑکی پر ٹھہر جاتا ہے۔ کھڑکی کے شیشوں سے روشنی جھانک رہی ہے۔ باہر اندھیرا ہے۔ کھڑکی کا کلوزاَپ۔ کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے انجلی کی پرچھائیں۔

— کٹ —

(۲)

انجلی کے کمرے کا اندرونی منظر ____

دیوار کے ساتھ ایک ایزل۔ پینٹنگ کا سامان۔ نئی پرانی تصویریں۔ کچھ ادھوری۔ ایک طرف چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل۔ میز پر ایک لیمپ جس کا شیڈ جھکا ہوا ہے۔

اُس کی سمٹی ہوئی روشنی میں انجلی کا چہرہ، سوچ میں گم، دکھائی دیتا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے اچانک رک کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔ گھڑی میں رات کا ایک بجتا ہے۔ دور سے آتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی صدا۔ کبھی کسی گاڑی کا ہارن چیختا ہے۔ پھر سناٹا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ بس گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے۔ انجلی سامنے ڈائری رکھے، دانتوں میں قلم دبائے کچھ سوچ رہی ہے۔

اس پورے منظر سے جیسے جیسے پردہ ہٹتا جاتا ہے ایک اجنبی، مردانہ آواز، بھاری اور گونجیلی سنائی دیتی ہے ــــ بیک گراؤنڈ سے ــــ

سناٹا۔ ہوا کا شور۔ گھڑی کی ٹک ٹک

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے
کیسی اندھیری رات ہے دیکھو
اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے
ایسا گاہک کون ہے جس نے
سُکھ دے کر دُکھ مول لیا ہے
کھڑکی کھول کے دیکھو تو باہر
دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے[1]

ــــ فیڈ آؤٹ ــــ

انجلی ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔ اپنی جگہ

[1] ناصر کاظمی

سے اٹھتی ہے اور ایک سائیڈ ریک پر رکھا ہوا ٹیپ
ریکارڈر آن کر دیتی ہے ــــ غلام علی کی آواز میں ناصر کاظمی
کی غزل کا کیسیٹ ــــ

فیڈ ان ــــ

غزل۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے ابھی

ــ فیڈ آؤٹ ــ

انجلی اب ایزل کی طرف دیکھتی ہے۔ ادھوری
تصویر۔ پھر فرش پر بچھے قالین سے بکھری کتابیں سمیٹ کر
ایک طرف رکھتی ہے اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔
انجلی کا کلوز اپ ــــ کیمرہ اب دیوار کی طرف اٹھتا ہے
جہاں گھڑی لگی ہوئی ہے۔ گھڑی کا زُوم اِن شاٹ۔ جب
تک کیسیٹ پر غزل چلتی رہتی ہے، انجلی آنکھیں بند کیے
پڑی رہتی ہے۔ غزل ختم ہوتے ہی اٹھ کر لیمپ بجھاتی
ہے۔ پھر لیٹ جاتی ہے۔ باہر سے چھن کر آتی ہوئی دھیمی
روشنی میں سارا کمرہ پرچھائیوں میں گھرا سا لگتا ہے ــــ

ــ کٹ ــ

دوسرا منظر

دیال صاحب کی اسٹڈی ــــ چاروں طرف
کتابیں۔ ایک طرف رائٹنگ ٹیبل۔ ایک ایزی چیئر ۔
دیال صاحب کرسی میں ڈوبے ہوئے پڑھ رہے ہیں ۔
دروازے پر دستک، بہت دھیمی ــــ
دیال صاحب اٹھ کر دروازہ کھولتے ہیں۔
: اوہ ! آرتی ــــ یہ تم ہو !

[آرتی کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے]

آرتی : (اندر آتی ہیں) آپ کو پتا ہے کب سے اس کمرے میں بند ہیں !
دیال صاحب: (دھیرے سے) ! SINCE ETERNITY
آرتی : (حیرت سے) کیا ؟
دیال صاحب : (بیٹھتے ہوئے) کمرہ ؟ کون سا کمرہ ؟

[آرتی حیرانی سے ان کی طرف دیکھتی ہیں پھر چائے بنانے لگتی ہیں ۔]

دیال صاحب : دیکھو آرتی ! بات یہ ہے کہ ہم سب ، چاہے گھر سے باہر ہوں، چاہے گھر میں ــــ ایک کمرے میں بند رہتے ہیں !
آرتی : (چائے کی پیالی بڑھاتی ہیں) پہیلیاں بجھا رہے ہیں آپ ۔
دیال صاحب : (مسکرا کر) یہی تو اصل الجھن ہے میری۔ سیدھی سادی باتیں بھی لوگوں کو پہیلیاں جان پڑتی ہیں ۔ ویسے سچ پوچھو تو ہر بات ایک پہیلی ہے ۔ ہر انسان ایک بھید ــــ اوہ ۔ خیر چھوڑو ــــ یہ بتاؤ، انجلی کہاں ہے۔
آرتی : ابھی کالج سے نہیں لوٹی ــــ
دیال صاحب : ارے۔ پانچ بج گئے۔ اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ کچھ کہ گئی تھی

جاتے سمے ؟

آرتی : نہیں ـــــ (ہونٹ بھینچ کر) وہ کبھی کچھ کہتی کب ہے ؟ سمجھ میں نہیں آتا ـــ

دیال صاحب : تو کیا کچھ سمجھنے کے لیے، سمجھانے کے لیے، کچھ کہنا یا بولنا ضروری ہے؟ ہم شبدوں پر اتنا بھروسہ کیوں کرنے لگے ہیں۔

آرتی : (اچانک گھبرا کر) شبد ـــــ شبد ـــــ یہ تم کہہ رہے ہو؟ تم ـــــ جو صبح سے شام تک، شام سے صبح تک بس شبدوں میں گھرے رہتے ہو۔ کتابوں میں ـــ اور شاید اپنے خوابوں میں ـــ

دیال صاحب : خواب ؟ سپنا ؟ سپنے دیکھنا تو کب کا چھوٹ گیا۔ ویسے स्वप्न بھی سچائی ہی کا ایک روپ ہے۔ جو جسے دکھائی دے، اُس کے لیے وہی سچ ہے ـ چلو چلیں۔ باہر چلتے ہیں ـــ

آرتی : (رک رک کر) باہر سے تمھارا مطلب ہے ـــــ ؟

دیال صاحب : ہاں ـــ بھیتر ـــ وہی جو تم سمجھ رہی ہو ـــ آنگن میں۔

[آرتی کا کھنکتا ہوا قہقہہ]

دیال صاحب : (حیرانی سے) یہ ـــ یہ کیا ـــــ ؟

[آرتی پھر ہنستی ہیں]

دیال صاحب : (سخت لہجے میں) آرتی ! آرتی ! تم میری ہنسی اڑا رہی ہو !

[آرتی کی ہنسی ـــــ لگاتار ہنسی ۔ دیال صاحب کے چہرے پر الجھن اور ناگواری کے آثار۔]

آرتی : (لگاتار ہنستے ہوئے) باہر کا بھیتر ـــــ بب (ہنستی ہیں) باہر ـــ باہر ـــــ بھیتر ـــ باہر کا بھیتر ـــ

[آرتی پر ہنسی کا دورہ سا پڑتا ہے۔ دیال صاحب کے چہرے پر گہری اداسی، غصّے اور بے چینی کا ملا جلا رنگ]

ـ فیڈ آؤٹ ـ

تیسرا منظر

دوپہر کا وقت ــــ کالج ۔ آرٹس انسٹی ٹیوٹ
کی عمارت ۔ چند لڑکے لڑکیاں ایک دائرہ بنائے لان میں
بیٹھے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں ۔ کچھ لڑکے اور لڑکیاں
ادھر اُدھر پتھر کی کسی بنچ پر، یا سیڑھی پر ــــ یا کسی پیڑ
کے تنے سے ٹیک لگائے ــــ اسکیچنگ کر رہی ہیں ۔
اچانک انجلی دکھائی دیتی ہے ۔ اسکیچ بُک گھٹنوں پر رکھے،
خاموش بیٹھی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے ۔

شوبھا : (دور سے) انجلی ــــ انجلی

[انجلی ایک بار مڑکر شوبھا کی طرف دیکھتی ہے ۔ پھر اپنے آپ میں
گم ہو جاتی ہے ــــ

نیلم : (شوبھا کی طرف بڑھتے ہوئے) ہائے شوبھا ! کسے پکار رہی ہو ! اوہ ! انجلی !

انجلی : (ایک بار پھر مڑ کر دیکھتی ہے) کیا بات ہے ؟

[دونوں شرارت آمیز انداز میں مسکراتی ہوئی انجلی کی طرف
جاتی ہیں ۔]

نیلم : (حیرت سے) ارے ، یہ کیا ؟

انجلی : (سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھتی ہے ۔)

شوبھا : کیوں ؟ کیا ہوا ؟

نیلم : (انجلی کی اسکیچ بُک کی طرف اشارہ کر کے) ذرا یہ دیکھو ــــ (اسکیچ بُک اٹھانا
چاہتی ہے ۔)

انجلی : (خفا ہو کر) چھوڑ دو اِسے ! چھوڑ دو !

[نیلم کا قہقہہ]

شوبھا : کیا ہے نیلم ؟

نیلم : سامنے ہرا بھرا پیڑ ہے۔ مگر اُس اسکیچ میں ____ ساری ٹہنیاں سوکھی ہوئی۔
کسی ڈال پر ایک پتّہ بھی نہیں۔ یہ نیچر اسٹڈی ہے کہ مذاق!

[انجلی اداسی سے اُس کی طرف دیکھتی ہے۔]

شوبھا : بھلا تمھیں ہوا کیا ہے انجلی! یہ سب کیا بکواس ہے۔ تم کب سے یہاں اکیلی
بیٹھی ہوئی ہو۔ چلو ____ اٹھو!

نیلم : لیکن! پہلے یہ بتاؤ کہ یہ قصّہ کیا ہے۔

[اسکیچ بُک کی طرف اشارہ کرتی ہے۔]

انجلی : (دھیرے سے) وہی پرانا قصّہ!

شوبھا : کیا؟

انجلی : کوئی بھی چہرہ ہو، آدمی کا یا پیڑ کا ____ جیسا کچھ دکھائی دیتا ہے، ضروری نہیں کہ
ویسا ہی ہو۔ ہر چہرے میں ایک، اور کبھی تو ایک ہی نہیں، انیک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔
یعنی وہی بات ____ جو تمھارے ڈیڈی کہتے ہیں!

[انجلی خالی خالی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتی ہے]

نیلم (ہنسی روکتے ہوئے) باہر کے بھیتر ____

[نیلم اور شوبھا کا قہقہہ]

[پس منظر سے بار بار باہر کے بھیتر ____
باہر کے بھیتر ____ کا Echo ۔

انجلی بُت بنی کھڑی رہتی ہے۔ اُس کے چہرے پر دیال صاحب کی اسٹڈی کا
منظر super impose ہوتا ہے ____]

۔ ڈزالو ۔

چوتھا منظر ____

صبح کا وقت۔ آرتی کچن میں کام کر رہی ہیں۔

کال بیل بجتی ہے۔ چونکتی ہیں۔ پھر باہر کا دروازہ کھولتی
ہیں۔ ایک نوجوان ــــ اٹیچی کیس لیے کھڑا ہے۔ آرتی
سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی ہیں ــــ

نوجوان : میں اجے ہوں۔ اور آپ میری مامی ــــ ہے نا ؟ (ہنستا ہے)

[آرتی کوئی جواب نہیں دیتیں۔ اجے حیرانی سے اُن کی طرف
دیکھتا ہے۔]

اجے : اندر تو آنے دیجیے مامی ــــ

[بغیر اجازت لیے اندر آجاتا ہے۔ آرتی ایک طرف کھسک جاتی
ہیں ــــ]

اجے : ماماجی کہاں ہیں ؟ [اجے کے چہرے پر شرارت]

آرتی : کون ماماجی ؟

اجے : یہ گھر دیال صاحب کا ہے۔ شنکر دیال جی ــــ جو کالج میں اِتہاس پڑھاتے ہیں۔

[آرتی گردن ہلاتی ہیں ــــ "ہاں" کے انداز میں]

اجے : (ہنس کر) ہماری مامی شاید بہت کم بولتی ہیں ــــ ماماجی اس سمے نہیں ہیں شاید۔
پاس پڑوس میں کہیں گئے ہوں گے ــــ

[آرتی کے چہرے پر وہی حیرانی]

اجے : کوئی بات نہیں ــــ میں ذرا مُنہ ہاتھ دھولوں۔ پھر چائے پیوں گا۔ پھر جم کر سوؤں گا۔
ریزرویشن تو مل گیا تھا۔ مگر مامی جی ــــ مجھے ریل گاڑی میں کبھی نیند نہیں آتی ــــ

[آرتی حیرت سے اسے دیکھتی رہتی ہیں]

اجے : برتھ پر لیٹے لیٹے آدمی لگاتار ہلتا رہتا ہے۔ ایسے ــــ [ہلنے کی ایکٹنگ کرتا ہے۔
پھر آرتی کو غور سے دیکھتا ہے] ہے نا مامی ! تو ماماجی جیسے ہی آئیں مجھے جگا دیجیے
گا ــــ

آرتی : (سنجیدگی سے) وہ اپنی اسٹڈی میں ہیں۔ کوئی پیپر لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا

کر کوئی انھیں ڈسٹرب نہ کرے۔ بارہ بجے تک کمرے سے نکلیں گے ___

اجے : (چمک کر) ارے واہ ___ یہ بھی کوئی بات ہے! میں اتنی دور سے چلا آرہا ہوں ___ انھیں دیکھ تو لوں ___ کدھر ہے اُن کی اسٹڈی ___

[آرتی ایک طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چہرے پر گھبراہٹ ___]

آرتی : (جھجکتے ہوئے) لل لیکن ___ [وہیں کھڑی رہتی ہیں]

اجے : (آگے بڑھتا ہے) لیکن ویکن کچھ نہیں۔ (آگے بڑھتا ہے) ماماجی ___ (پکارتے ہوئے) ماماجی ___ (دروازے پر دستک)

[کیمرہ آرتی پر مرکوز رہتا ہے۔ اجے کا سوٹ کیس قریب ہی فرش پر رکھا ہوا ہے۔]

پاس سے آتی ہوئی آوازیں :

اجے : (گڑبڑا کر) ارر ارے رے۔ یہ کیا ___ آآپ ___

انجلی : میں انجلی ہوں۔ آپ کون ہیں؟

اجے : میں اجے ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میں آپ سب کو جانتا ہوں۔ لیکن میں تو سمجھا تھا کہ یہ ماماجی کی اسٹڈی ہے۔

انجلی : اُن کی اسٹڈی وہ سامنے ہے! (دروازہ بھڑ سے بند کرنے کی آواز)

[آرتی کے چہرے پر پریشانی ___]

۔ کٹ ۔

[اجے اب دیال صاحب کے کمرے پر دستک دیتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے ___

دیال صاحب کی اسٹڈی۔ اپنی اسٹڈی کے دروازے پر حیران سے کھڑے ہیں ___]

اجے : ماماجی ___ یہ میں ہوں ___ اجے ___

دیال صاحب : (اُسے گھور کر دیکھتے ہوئے) ہوں ___ (سوچنے کے انداز میں) اجے ___ اجے

فرآم کان پور ۔۔۔؟

اجے : (ہنس کر اچھل پڑتا ہے) ہاں ہاں فرآم کان پور۔ میں بہت چھوٹا تھا جب آپ نے مجھے دیکھا تھا۔ ماں جی بتاتی تھیں کہ آپ راجن ماما کے ساتھ گھر آیا کرتے تھے۔۔۔ ایک روز میں نے آپ کی پینٹ پر سیاہی الٹ دی تھی ۔۔۔ یاد ہے ۔۔۔ یاد ہے!

[دیال صاحب کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی۔ ان کا کلوزاپ DEFOCUSSED ہونٹ ہلتے ہوئے ۔ دھیرے دھیرے کہتے ہیں ۔۔۔"یاد ہے ۔۔۔ یاد ہے!" اجے حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے ۔۔۔]

۔ ڈزالو ۔

پانچواں منظر ۔۔۔

دیال صاحب کی اسٹڈی ۔ ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ آرتی آتی ہیں۔

آرتی : میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟

[دیال صاحب جواب دینے کے بجائے ویران آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتے ہیں]

آرتی : میں نے موسموں کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر آپ کو نہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔

[دیال صاحب پھر اُسی انداز میں آرتی کی طرف دیکھتے ہیں۔]

آرتی : لیکن جب سے اجے یہاں آیا ہے، آپ بدل گئے ہیں۔ بہت بدل گئے ہیں ۔۔۔

[دیال صاحب خاموش رہتے ہیں۔]

آرتی : اپنی اسٹڈی میں بیٹھے ہوئے، یا لیٹے ہوئے، آپ بس سوچتے رہتے ہیں ۔۔۔ اور یہ سوچ آپ کو ایک ہی راستے پر لے جاتی دکھائی دیتی ہے۔

[دیال صاحب غور سے آرتی کی طرف دیکھتے ہیں]

آرتی : اُداسی کا راستہ!

[وقفہ]

میں اس کا کارن جان سکتی ہوں ___؟

[دیال صاحب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کرسی پر دونوں ہاتھ ٹیکے ہوئے ۔]

دیال صاحب: تم سچ سُن سکو گی آرتی؟

[آرتی کے چہرے پر الجھن ۔]

دیال صاحب: اور سچ سُن کر بھی بدلوگی نہیں؟

آرتی: نہیں!

دیال صاحب: [گمبھیر ہیجے میں] تو سنو!

[فلیش بیک]

پچیس برس پہلے ___ اُن دنوں میں کان پور میں پڑھتا تھا ___ ڈی۔ اے۔ وی کالج میں ___ میرا ایک دوست تھا ___ راجن ___ ہم دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔ راجن ہی کے گھر ___ پریڈ ایریا میں اس کا گھر تھا ___

کلپنا راجن کی بہن تھی ___ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ___ لیکن ___ جب عمر بھر ساتھ نبھانے کی بات سامنے آئی تو کلپنا نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی ___ میں ایک معمولی پترکار تھا ___ میرا نہ تو کوئی ورتمان تھا، نہ بھوِشیہ ___

اور کلپنا سیکیورِٹی چاہتی تھی ___

اجے کلپنا کا بیٹا ہے ___

[آرتی گہری آنکھوں سے دیال صاحب کی طرف دیکھتی ہیں ۔]

دیال صاحب: مجھے کسی رشتے ناطے پر بھروسہ نہیں رہا آرتی۔ میں ہر طرف سے لوٹ کر اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ میں کسان کا بیٹا تھا ___ کاروباری جیون کے روپ بہروپ میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آتے۔

[آرتی کا کلوزاپ]

دیال صاحب: میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا شاید۔ کبھی کبھی جیون میں ایک ایسی استھتی جنم لیتی ہے کہ کچھ جانے، کچھ سمجھے بنا بھی ہم سب کچھ جان اور سمجھ لیتے ہیں۔

[دیال صاحب کا کلوزاپ]

دیال صاحب: میں نے زندگی کا جو راستہ اپنایا ہے، وہاں سارے رشتے ناطے اپنا ارتھ بدل چکے ہیں ــ سماج، سنسار، سب کچھ ــ میرے لیے اب بے معنی ہے ــ

[آرتی کا کلوزاپ]

دنیا سمٹ گئی ہے۔ دوریاں بڑھ گئی ہیں۔ ہر سمبندھ کو ناپنے کا، ہمارے پاس ایک ہی پیمانہ رہ گیا ہے ــ ہر انسان ایک کموڈیٹی ہے۔ ہر سمبندھ بیچا اور خریدا جاسکتا ہے ــ

[آرتی کا کلوزاپ]

دیال صاحب: اسی لیے تو میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں ــ تمھاری اور انجلی کی دنیا میں خوش ہوں ــ اور نہیں چاہتا کہ ہماری اس دنیا پر چاروں اور پھیلی ہوئی کاروباری دنیا کی پرچھائیں پڑے۔

[اچانک سائڈ ریک پر رکھے کاغذ اڑنے لگتے ہیں۔]

دیال صاحب: (چونک کر ــ کاغذ سمیٹتے ہوئے) ارے ــ یہ کھڑکی کس نے کھول دی ــ بند کرو ــ بند کردو اسے آرتی ــ بند کردو کھڑکی نہیں تو میری ساری فائلیں بکھر جائیں گی ــ

[آرتی کھڑکی بند کر دیتی ہیں۔ دونوں کاغذات سمیٹتے ہیں۔]

ــ فیڈ آؤٹ ــ

چھٹا منظر ــ

کسی پارک کا ایک ویران گوشہ۔ انجلی اور راجے

ساتھ ٹہلتے ہوئے — سہ پہر کا وقت —

اجے : (ایک بنچ کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ — ذرا دیر بیٹھتے ہیں۔

[دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ اجے سگریٹ سلگاتا ہے۔]

اجے : (شرارت بھری نظروں سے انجلی کی طرف دیکھتا ہے) کم سے کم اتنا تو ہوا کہ تم آج گھر سے باہر نکلیں —

انجلی : (کھوئے ہوئے انداز میں) ہوں!

اجے : دیکھو! آسمان کتنا نیلا ہے — اور چاروں طرف کتنی ہریالی ہے — اور سمٹتی ہوئی دھوپ میں بھی کتنی چمک ہے —

انجلی : (اسی انداز میں) ہنوں!

اجے : دیکھو — بچے ہیں — اور پھول — اور ایک دوسرے سے پیار کرتے ہوئے، ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے — لوگ —

انجلی : ہنوں!

اجے : (ہنس کر) ارے بابا — اور بھی کچھ بولو!

انجلی : کیا بولوں؟

اجے : کوئی بھی بات کرو — کسی کی بھی!

انجلی : کس کی —؟

اجے : میں نے لگ بھگ ہر رات دیکھا ہے۔ جب ساری کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں، ایک کھڑکی کھلی دکھائی دیتی ہے — تمہارے گھر کے سامنے —

انجلی : ہنوں!

اجے : کون ہے وہ؟

انجلی : بلراج!

اجے : کیا کرتا ہے وہ —؟

انجلی : چترکار ہے!

اجے : تم اُسے جانتی ہو؟
انجلی : بس اتنا ہی — اور وہ بھی اس طرح کہ ایک بار اس کا کمرہ بند دیکھ کر ڈاکیہ اُس کے نام کی رجسٹری ہمارے گھر دے گیا تھا —
اجے : اُس سے کبھی ملنا بھی ہوا؟
انجلی : ہاں! اُسی روز — وہ اپنی رجسٹری لینے ہمارے گھر آیا تھا۔
اجے : اس سے کچھ بات بھی ہوئی؟
انجلی نہیں —
اجے : کیوں؟
انجلی : وہ باہر ہی سے چلا گیا تھا —
اجے : تم نے اُسے روکا تھا؟
انجلی : نہیں!
اجے : ماماجی اور مامی جی نے بھی نہیں روکا —؟
انجلی : نہیں!
اجے : اِس کا کارَن؟
انجلی ڈیڈی اور ممی کو اس بات کی عادت نہیں —
[اجے سوالیہ نظروں سے انجلی کی طرف دیکھتا ہے۔]
انجلی : وہ کبھی کسی سے ملنے نہیں جاتے — کبھی کوئی اُن سے ملنے نہیں آتا —
اجے : (غور سے انجلی کی طرف دیکھتا ہے) کیا یہ بات اُچت ہے؟
انجلی : پتا نہیں — یہ سوال مَن میں کبھی اٹھا ہی نہیں —
اجے : ایک بات پوچھوں انجلی؟
انجلی : پوچھو!
اجے : ماماجی اور مامی جی نے میرے یہاں آنے، پھر رہنے کا بُرا تو نہیں مانا —
انجلی : شاید نہیں —

اجے : اِس کا کارن بتا سکتی ہو — ؟

[انجلی جواب نہیں دیتی۔ دور سڑک کی طرف دیکھنے لگتی ہے — کیمرہ پَین کرتا ہوا سڑک کے منظر کو سمیٹتا ہے — دوکانیں۔ آتی جاتی موٹر کاریں۔ پھر ایک میڈیکل اسٹور کا بورڈ — کیمرہ اسی بورڈ پر ٹھہر جاتا ہے۔]

اجے : تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا انجلی —

انجلی میرا خیال ہے کہ تم — جو ایک ڈاکٹر ہو — تمہیں ایسے بے کار سوالوں میں نہیں الجھنا چاہیے —

اجے : (سنجیدہ لہجے میں اداسی کے ساتھ) انجلی!

انجلی : ہاں! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اجے۔ آدرش اسی لیے پالے جاتے ہیں کہ ایک روز ٹوٹ پھوٹ جائیں —

اجے : انجلی!

انجلی : جو اِس ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے — وہ آدرش تو نہیں!

[اجے اچانک اٹھتا ہے۔ انجلی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے]

اجے : چلو — گھر لوٹ چلیں — ماں پریشان ہو رہی ہوں گی —

[انجلی کا ایک لمبا قہقہہ — اجے ڈری ڈری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ انجلی کی ہنسی اور تیز ہو جاتی ہے۔]

— ڈزالو —

ساتواں منظر —

رات — انجلی کی گلی کا لانگ شاٹ۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیرا — کیمرہ انجلی کے کمرے کی کھڑکی پر ٹھہرتا ہے۔ شیشوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی —

اس روشنی میں شیشوں کے پیچھے انجلی کی پرچھائیں سی۔
پھر کیمرہ پین کرتا ہوا سامنے والے گھر کی کھڑکی پر ٹھہرتا
ہے۔ یہ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اندر سے دھیمے سُروں
میں آتی ہوئی ستار کی گت۔

۔ کٹ ۔

اچانک انجلی کے کمرے کی کھڑکی کھلتی ہے — انجلی
کا جھانکتا ہوا چہرہ — کھڑکی پھر بند ہو جاتی ہے —

۔ کٹ ۔

سنسان گلی میں بلراج کی پرچھائیں — بیک
شاٹ۔ کیمرہ زُوم آؤٹ کرتا ہوا دور تک گلی کے منظر
کو سمیٹتا ہے۔ بلراج کی پرچھائیں دھیرے دھیرے
چھوٹی ہوتی جاتی ہے —

۔ ڈزالو ۔

آٹھواں منظر —

دیال صاحب کی اسٹڈی — دیال صاحب اور
آرتی بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہیں۔ سہ پہر کا وقت۔

[دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کا کلوز اپ]

دیال صاحب: سمجھ میں نہیں آتا — یہ اجے نے اچانک گھر کیوں چھوڑ دیا۔

آرتی : ہاں! سمجھ میں نہیں آتا —

دیال صاحب: انجلی سے تو کوئی بات نہیں ہو گئی تھی ؟

آرتی : شاید نہیں — اور ہوئی ہو تو مجھے پتا نہیں —

دیال صاحب: تم نے انجلی سے پوچھا ؟

آرتی : نہیں !

دیال صاحب : کیوں ؟

آرتی : انجلی خوش دکھائی دیتی ہے۔

دیال صاحب : اجے کے جانے سے ـــ

آرتی : پتا نہیں!

[وقفہ]

دیال صاحب : (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) انجلی ابھی کالج سے نہیں لوٹی!

آرتی : آجائے گی ـــ

دیال صاحب : تمھیں چنتا نہیں اِس بات کی۔

آرتی : نہیں ـــ

دیال صاحب : کیوں ؟

آرتی : اس لیے کہ انجلی ان دنوں پرسنّ دکھائی دیتی ہے ـــ

دیال صاحب : جب سے اجے گیا ہے ؟

آرتی : ہاں ـــ شاید ـــ

دیال صاحب : تم نے کلپنا کی چٹھی کا کیا جواب سوچا ہے؟

آرتی : میں نے انھیں جواب دے دیا ہے۔

دیال صاحب : (گھبراہٹ میں اچھل پڑتے ہیں) کیا؟

آرتی : میں نے انھیں چٹھی بھیج دی ہے۔

دیال صاحب : (سنبھلتے ہوئے) کیا لکھا ہے تم نے کلپنا کو ـــ

آرتی : یہی کہ ہر ویکتی کا ادھیکار دوسرے ویکتی پر سیمت ہوتا ہے۔

دیال صاحب : کیا مطلب ہے تمھارا اس بات سے ؟

آرتی : یہی کہ انجلی پر ہمارا ادھیکار بھی سیمت ہے ـــ

دیال صاحب : اور ؟ اور کیا لکھا ہے تم نے ؟

آرتی : یہی کہ اپنے جیون کا فیصلہ انجلی خود کرے گی۔ ہم اُس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔

دیال صاحب : اور؟
آرتی : اور انجلی نے شاید فیصلہ کرلیا ہے۔
[دیال صاحب اداس نظروں سے آرتی کی طرف دیکھتے ہیں۔]
آرتی : ہاں! اور مجھے اُس کی طرف سے اب کوئی الجھن، کوئی چنتا ــــ نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے ــــ رات دیر گئے تک، اُس کے کمرے کی کھڑکی کھلی رہتی ہے ــــ اور وہ اب گئے دنوں کی طرح، اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی، اپنے آپ سے الجھتی دکھائی نہیں دیتی ــــ
[دیال صاحب ایک لمبا سانس لیتے ہیں۔]
ـ کٹ ـ

نواں منظر ــــ

سہ پہر کا وقت ــــ سڑکوں پر چہل پہل، کھلا آسمان ــــ پرندے ــــ بلراج اور انجلی پارک کی ایک بنچ پر ساتھ بیٹھے ــــ ہنس ہنس کر باتیں کرتے نظر آتے ہیں ــــ
[کلوزاپ شاٹ]
انجلی : (گھڑی دیکھتے ہوئے چونک کر ہونٹ سکوڑتی ہے) ہائے ــــ بلراج، دیکھو تو ــــ چھے بجنے والے ہیں ــــ
بلراج : پھر؟
انجلی : پھر کیا! اب اٹھو! چلتے ہیں!
بلراج : کہاں؟
انجلی : ارے گھر چلتے ہیں اور کہاں!
بلراج : تم ابھی بھی اپنی کایرتا میں دبی ہوئی ہو!
انجلی : کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

بلراج : تمہیں شاید اپنی ممّی اور ڈیڈی کا ڈر ہوگا !

انجلی : (مسکرا کر) نہیں !

بلراج : کیوں ؟

انجلی : اُنھیں ـــ ممّی اور ڈیڈی دونوں کو پتا ہوگا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں ـ (گمبھیر لہجے میں) چلو، چلتے ہیں ـــ

[دونوں اٹھتے ہیں۔ سڑک کی طرف چل پڑتے ہیں۔ دھیرے دھیرے اُن کی شبیہیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں ـ]

- ڈراپ -

[مانڈ بہاگ کی ایک گت
ستار پر ـــ]

کاتب : ممتاز احمد بستوی

I'm an atheist. I don't see any moral superstructure to the universe at all. I consider my work optimistic in that the people, during the period I'm writing about them, are experiencing intense emotion. It is my belief that this is all there is to it. There is nothing beyond this. I think we're trapped, if trapped is the right word, into a world that cares less and less for us as individual units, and creates more and more agony and pain and trouble by considering us as blocks, un-individuals. With varying lebels.

Don Carpenter